نایاب جیلانی

بڑی افسردہ اور غمگین شام ہاسٹل کی دیواروں سے لپٹ لپٹ کر بین کر رہی تھی۔ آج گگن پر کوئی چاند تھا نہ کوئی تارہ۔ ہر شے سیاہ دھوئیں میں لپٹی عجب خوفناک اور بھیانک دکھائی دے رہی تھی۔

ہاسٹل کے لان میں لگے سرسبز اونچے اونچے درخت کسی دیو کا منظر پیش کر رہے تھے۔ ہوا بھی سخت خشک اور کٹیلی تھی۔ زمین پر پاؤں رکھا تو یوں لگا گویا انگارے بچھے ہوں۔ اتنی تپش، اس قدر جلن تھی کہ آنکھیں برس برس کر تھکنے لگیں... زمین گرم نہیں

مکمل ناول

تھی یہ آگ تو اس کے اندر بھڑک رہی تھی، سلگ رہی تھی۔ اس کا جسم تنور کی مانند تپ رہا تھا۔ کوئلوں کی بھٹی کی طرح سلگ رہا تھا۔ پیروں پر آبلے تھے، آنکھیں لہو لہو تھیں اور روح زخم زخم۔

"اس نے میری انسلٹ کی مجھے برا بھلا کہا میں خاموش رہی۔ اس نے مجھے ذلیل کیا، میں خاموش رہی۔ میری زبان گویا تالو سے چپک گئی تمہیں کیا پتا عافیہ! مجھ پر کتنے عذاب اترے تھے مگر میں پھر بھی چپ تھی۔ میری آواز کھو گئی تھی الفاظ گم ہو گئے اور لبوں پر تالا لگ گیا مگر جب اس نے میرے کردار کو رگیدا، میری عزت نفس، نسوانی انا کو مجروح کرنا چاہا تو میں خاموش نہیں رہ سکی۔ میں نے اسے بھی اذیت سے دوچار کرنا چاہا۔ مگر کچھ بھی نہ کر سکی صرف روتی رہی" آنسو بہاتی رہی... مجھے اس کا منہ توڑ جواب دینا چاہیے تھا۔ اس کے چہرے کو مسخ کر دینا چاہیے تھا مگر میں ساکت، خاموش اور گم سم کھڑی رہ گئی اور وہ میری ذات کے پرخچے اڑاتی شان سے چلی گئی۔

اس نے مجھے زارون کی، سب کی نظروں سے گرانا چاہا۔ میرے دامن میں ذلتوں کا ڈھیر لگا دیا۔ میری اوڑھنی کو لفظوں کے تیروں سے چھلنی کر دیا۔ وہ میری ہستی کے غرور کو تہس نہس کر گئی۔ وہ عدن فرجمند بہت غرور ہے اسے باپ کی دولت و حشمت پر۔ اس نے مجھے انسلٹ کیا، سمجھا۔ مجھے پیروں سے کچل کر چل دی۔ نہیں عدن فرجمند تم نے اچھا نہیں کیا۔ تم نے مجھے ذلیل کیا میرے باپ نے مجھے انسانیت کے درس دیے تھے مگر یہاں تو کچھ نہیں ہے نہ انسانیت، نہ محبت نہ عزت۔" وہ رو رو کر بے حال ہو گئی تھی۔ اس کا سر عافیہ کی گود میں تھا جو خود بھی بے آواز رو رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

بوئنگ سیون تھری سیون ایس طیارہ اسلام آباد ایئرپورٹ پر لینڈ کر چکا تھا۔ وہ ایئرپورٹ کی شاندار عمارت سے باہر نکلی۔ ٹیکسی کی تلاش میں نظر دوڑائی تو نگاہ نے ایک چہرے کا احاطہ کر لیا تھا۔

قاسم انکل پرجوش سے اس کی طرف بڑھے تھے۔ انہوں نے یقیناً" اسے پہچان لیا تھا۔ اور وہ بھی انکل کو پہچان چکی تھی کیونکہ اس نے انکل کی تصویریں پاپا کے

پاس دیکھ رکھی تھیں۔

"شہرے..." انکل نے آگے بڑھ کر یقین بھرے لہجے میں کہا تو وہ مسکرا کر سر ہلانے لگی تھی۔

"کیسی ہو بیٹا! سفر میں پریشانی تو نہیں ہوئی؟" انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔

"پہلی مرتبہ سفر کیا ہے اکیلے' پاپا کے بغیر۔" وہ اس کے سوٹ کیس' ٹیکسی میں رکھواتے ہوئے بول رہے تھے۔ وہ انہیں کیا بتاتی کہ ساری زندگی اس نے تنہا ہی سفر کیا ہے۔ کیونکہ وہ سیاحت کی دیوانی تھی۔ پاپا ہارٹ پیشنٹ تھے کہیں آتے جاتے نہیں تھے البتہ انہوں نے اس کے جنونی شوق کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹ کھڑی نہیں کی تھی بلکہ وہ خود اس کے گھومنے پھرنے کے لیے تمام انتظامات کرتے تھے۔

وہ صباح (ملائشیا) کی رہائشی تھی بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ وہ لوگ کئی نسلوں سے "صباح" میں آباد تھے اس کے گرینڈ پاپا کے دادا بہت سال پہلے تلاش معاش کی غرض سے ملائشیا چلے گئے تھے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ اس کے پاپا حسنین احمد کی شادی پاکستان کے ایک بڑے خاندان میں ہوئی تھی اسی طرح پاکستان سے تعلق برقرار تھا۔ ممی کا میکا بھی پاکستان کے شہر کراچی میں آباد تھا مگر نہ جانے کیا وجہ تھی کہ پاپا اپنے آخری وقت میں انکل قاسم کا ایڈریس دے کر پاکستان ہمیشہ کے لیے رہنے پر آمادہ کر چکے تھے۔ قاسم انکل نا صرف پاپا کے دوست تھے بلکہ کزن بھی تھے اکثر فون پر انکل اور ان کی بیگم ثوبیہ آنٹی سے بات چیت ہوتی رہتی تھی۔

وہ بہت شوق اور اشتیاق کے عالم میں کھڑکی سے باہر بھاگتے دوڑتے حسین فطری مناظر کی دلکشی میں کھوئی ہوئی تھی جب انکل کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"حسنین ٹھیک کہتا تھا کہ شہری پاکستان کی دیوانی ہے۔"

"مجھے پاکستان سے فطری محبت ہے' یہ میرے بزرگوں کا ملک ہے۔" اس نے مسکرا کر مختصر سا جواب دیا اور ایک مرتبہ پھر ارد گرد کی خوبصورتی میں کھو گئی۔ مگر صرف آدھے گھنٹے کے بعد خوبصورت مناظر کہیں دور رہ گئے تھے۔ اسے اک پل کے لیے یوں محسوس ہوا گویا وہ ایک فلم دیکھ رہی تھی جس کا اختتام چند منٹوں میں ہی ہو گیا تھا۔ ٹیکسی اب پنڈی کی شاہراہ پر رواں دواں تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ایک قدرے پرانی سی بلڈنگ کے قریب ٹیکسی رک گئی۔

"آؤ بیٹا!" وہ انکل کی ہمراہی میں کچھ حیران پریشان سی سیڑھیاں چڑھنے لگی تھی۔ دروازہ پیاری سی ثوبیہ آنٹی نے کھولا تھا۔ اسے دیکھتے ہی انہوں نے بھرپور انداز میں لپٹا کر ماتھے کو چوما۔

"شہری تو تصویروں سے زیادہ خوبصورت ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے انکل سے کہہ رہی تھیں۔ شہرے بھی دھیرے سے مسکرا دی۔

یہ ایک تنگ سا تین کمروں کا فلیٹ تھا۔ وہ انکل' آنٹی کی مالی پوزیشن کا اندازہ لگا کر قدرے پشیمان ہو گئی تھی۔

"پاپا نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ انکل کی معاشی حالت کس قدر دگرگوں ہے۔" شہری نے افسردگی سے سوچا۔

اسے حقیقتاً" ان کی موجودہ حالت دیکھ کر گہرا صدمہ پہنچا تھا۔ اور جب وہ آنٹی کے اصرار پر فریش ہونے کے بعد کھانے کی میز تک آئی اور ٹیبل کو لوازمات سے پر دیکھ کر مزید پشیمان ہو گئی۔

"آنٹی! آپ نے کیوں اتنا تکلف کیا ہے' آپ کے خیال میں کیا میں پیٹو ہوں۔"

"تم ہماری بیٹی ہو شہرے! خود کو مہمان مت سمجھنا' کھانا کھاؤ... میں تمہارے لیے دودھ گرم کرتی ہوں۔ پھر آرام سے سو جانا۔" انہوں نے محبت سے کہا اور پھر مختصر سے کچن کی طرف بڑھ گئیں۔ انکل بھی آ گئے تھے اور کھانے کے دوران اس کی پلیٹ میں کچھ نہ کچھ رکھ رہے تھے۔ آنٹی گرم گرم پھلکے لے آئیں۔

"شہرے! کھانا کھاؤ تو گھور نہیں۔" انہوں نے خفگی سے کہا تو وہ پلیٹ پر جھک گئی۔

"یہ سویٹ تو ٹرائی کرو۔" انکل نے ٹرائفل کا باؤل اس کے سامنے کھسکا دیا تو وہ مروت کے مارے تھوڑی سی سویٹ پیالی میں نکال کر کھانے لگی۔ اسے سویٹ میٹ میں کچھ بھی پسند نہیں تھا حتیٰ کہ چاکلیٹ اور آئسکریم بھی وہ نہیں کھاتی تھی۔ چائے بغیر چینی کے' اس کے جاننے والے بے حد حیران ہوتے تھے۔ اسے سپائسی فوڈ پسند تھے۔ املی کی چٹنی اور گول گپے فیورٹ تھے جس کی بدولت اس کا گلا اکثر خراب رہتا تھا اور پاپا سے بہت ساری ڈانٹ کھانی پڑتی۔

"شہری! تمہیں پاکستان دیکھنے کا بہت شوق تھا نا... اب خوب گھومنا پھرنا انجوائے کرنا۔" آنٹی کھانے کے بعد برتن سمیٹنے لگیں تو شہرے بھی ان کی ہیلپ کے خیال سے کچن میں آ گئی۔

"آنٹی! گھوموں پھروں گی تو ضرور مگر اس سے پہلے میں اپنے ایڈمیشن کے متعلق بہت کانشس ہو رہی ہوں۔ کیا مجھے عانیہ کی یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل جائے گا نا؟" اس کی آنکھوں میں پریشانی کے ہلکے سائے دیکھ کر آنٹی نرمی سے مسکرائیں۔

"کیوں پریشان ہو رہی ہو؟ ابھی تمہاری عانیہ سے فون پر بات کرواتی ہوں۔ عانیہ کو تم سے ملنے کا بے حد شوق ہے۔ وہ ہاسٹل میں شدت سے تمہارا انتظار کر رہی ہے۔" آنٹی نے اپنی اکلوتی بیٹی عانیہ کا حوالہ دیا تھا۔ شہرے پرسکون سی سر ہلا کر برتن خشک کرنے لگی اسی پل آنٹی نے شہرے کی طرف مڑ کر دیکھا اور اس کے ہاتھ سے پلیٹ پکڑ کر ٹیبل پر رکھ دی۔

"یہ دودھ کا گلاس سلیب پر سے اٹھاؤ اور سامنے کمرے میں چلی جاؤ۔ ایک بھرپور نیند لینے کے بعد تم فریش ہو جاؤ گی۔ اب صبح ملاقات کریں گے جاؤ شاباش۔ یہ سامنے والا عانیہ کا کمرہ ہے۔" انہوں نے خوشدلی سے کہا تو وہ ناراض سی بغیر گلاس اٹھائے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

یہ کمرہ عانیہ کا تھا جس میں دو پلنگ تھے' ایک کتابوں سے لدی ٹیبل تھی۔ ایک عدد وارڈ روب اور بس۔ اس نے دو منٹ میں پورے کمرے کا جائزہ لیا اور پھر پلنگ پر دراز ہو گئی۔

کچھ دیر بعد آنٹی فون سیٹ اٹھا کر اور دودھ سے لبالب بھرے گلاس سمیت آ گئی تھیں۔

"تم دودھ پیو' تب تک میں عانیہ سے بات کرتی ہوں۔" آنٹی نے گلاس زبردستی اس کے ہاتھ میں تھمایا اور پھر خود فون پر مصروف ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد انہوں نے فون شہرے کو تھمایا۔

"عانیہ تم سے بات کرنے کو بے چین ہے۔"

"آپ ہمارے ملک آئیں آپ کا بہت شکریہ۔" شہرے نے ریسیور کان سے لگایا ہی تھا کہ دوسری طرف گنگناتی آواز سنائی دی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکان پھیل گئی تھی۔

"کیسی ہو عانیہ؟"

"فرسٹ کلاس' ایک دم فریش' حسین' ذہین اور باقی تم دیکھنے کے بعد بتانا۔" عانیہ نے شوخی سے مبالغہ آمیزی کی حد کر دی تھی۔ شہرے مسکرائی اور بولی۔

"میں نے اپنے سرٹیفکیٹ بھجوا دیے تھے کیا ایڈمیشن ہو جائے گا؟"

"کیوں نہیں' تمہارا اکیڈمک ریکارڈ بہت اچھا ہے۔" عانیہ نے کھلے دل سے سراہا تھا۔ شہرے اس سے بات کر کے قدرے مطمئن سی ہو گئی تھی۔ اسی لیے آنٹی اور انکل کو شب بخیر کہہ کر سکون سے پلنگ پر لیٹ گئی اور آنکھیں بھی موند لیں مگر نیند پلکوں کے اس

یار بہت سے منظر گڈمڈ ہو رہے تھے... کچھ یادیں، اپنا گھر، آنگن، دریچہ... وہ سوچوں کی رو میں بہتے ہوئے دور بہت دور اپنے شہر میں جا پہنچی تھی جہاں اس کا بہت ہی خوبصورت گلابی پھولوں سے ڈھکا "ہوم لینڈ" تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ حسنین احمد اور باسمہ حسنین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ ان کی شادی کے چار سال بعد پیدا ہوئی تھی۔ منی سی بے حد سپید بچی کو پہلی مرتبہ گود میں لے کر حسنین احمد نے اسے (شہرے) (SHEHRAY) کا نام دیا تھا۔ یہ ایک ترکی نام تھا جس کے معنی انتہائی خوبصورت کے تھے۔ وہ ایک صحت مند اور حسین بچی تھی اور اپنی ممی اور پاپا کی آنکھوں کا تارہ۔ شہرے نے ممی کو نہیں دیکھا تھا۔ ہلکی سی کوئی اچھی "یاد" بھی ماں کے حوالے سے اسے یاد نہیں تھی کیونکہ ممی ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئی تھیں۔ اس سیاہ شام کے بعد وہ اور پاپا ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی بن گئے تھے۔ حسنین احمد کی شہرے میں جان بند تھی۔ وہ اسے دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ اس کی ہر فرمائش ہر خواہش کو بن کہے جان جاتے اور پلک جھپکتے پورا کر دیتے۔ اس کی آنکھ کے آنسو ان کا دل پگھلا دیتے تھے۔ اتنی ڈھیر ساری توجہ اور محبت نے اسے بگڑنے نہیں دیا تھا۔

اس کی شخصیت میں کوئی دراڑ نہیں تھی کیونکہ اس نے ایک محبت بھرے متوازن ماحول میں پرورش پائی تھی۔ وہ سلجھی سوچوں کی حامل ایک نہایت بااخلاق، خلیق، شفیق، نرم دل، ہمدرد فطرت کی لڑکی تھی۔ پاپا نے اسے راست گوئی، سچائی اور سب کی عزت و تکریم کے جو اسباق یاد کروائے تھے وہ ہمیشہ کے لیے حافظے میں محفوظ ہو گئے تھے۔ وہ اپنے پاپا کی بہت ہی لاڈلی اور فرماں بردار بیٹی تھی۔

شعور کے مراحل طے کرتے ہی اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کے پاس جو سب سے قیمتی "متاع" ماں تھی وہ نہیں ہے۔ اور اس احساس کی شدت نے شہرے کو پاپا کے مزید قریب کر دیا تھا۔ وہ ان کا پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھتی۔

وہ اسٹڈی میں ہوتے تو وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد چائے کا گرما گرم کپ پہنچا دیتی۔ پاپا سونے کے لیے بیڈ روم کی طرف بڑھتے اور شہرے چپکے سے نیم گرم دودھ کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ آتی۔ رات کو ان کے آفس جانے کی تیاری پوری ذمہ داری سے کرتی۔ کپڑے، ٹائی، کوٹ اور میچنگ اسٹاکنگ۔ ہر شے ترتیب سے صوفے پر رکھی ہوتی، جوتے پالش شدہ چمک رہے ہوتے اور حسنین احمد کی آنکھیں بھیگنے لگتیں۔

یہ شہرے کی روٹین تھی جو پچھلے چھ ماہ سے وہ دیکھ رہے تھے ایک دن انہوں نے شہرے کو ٹوکا تو وہ ناراض ہو گئی۔

"گھر میں یہ سب کچھ نہ کروں تو کون کرے گا؟"

"مس ایوا ہیں نا۔" انہوں نے نرمی سے سمجھانا چاہا تو وہ مزید خفا ہو گئی اور بولی۔

"مجھے مس ایوا اچھی نہیں لگتیں۔ اور نہ ہی بٹلر جمل اچھا لگتا ہے دونوں چور ہیں۔ سارا کچن خالی کر دیتے ہیں۔ اور فریج سے پھل نکال کر کھاتے ہیں۔ آپ بس انہیں فارغ کریں۔"

وہ کچھ دنوں سے اپنے گھر کے دونوں نوکروں کا بغور جائزہ لے رہی تھی ان کی تمام تر حرکتوں کو نوٹ کرنے کے بعد اس نے انہیں فارغ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ حسنین احمد دل ہی دل میں اپنی بیٹی کی ذمہ دارانہ طبیعت سے بہت خوش تھے۔ انہوں نے خود بھی دونوں نوکروں کا باریک بینی سے جائزہ لیا اور بیٹی کی فارقہ حس کو سراہا بھی۔

مس ایوا اور جمل دونوں کو فارغ کر دیا گیا تھا۔ کچھ کوششوں کے بعد انہوں نے "حسن" نامی ایک بوڑھے خانساماں کو بطور کک گھر میں ملازمت دے دی تھی جو کہ پہلے ان کی فوڈ فیکٹری میں پیکنگ کا کام کرتے تھے۔ وہ امانت دار اور کم گو انسان تھے جلد ہی شہرے ان سے متاثر ہو گئی تھی۔ ان کی ککنگ کی خوب خوب جی بھر کر تعریفیں کرتی۔ اکثر ان سے کچھ نہ کچھ پکانا سیکھ رہی ہوتی تھی مگر ہزار کوششوں کے بعد بھی

اسے کچھ پکانا نہیں آیا تھا۔

حسن بابا کے آجانے سے کک کا مسئلہ تو حل ہوا مگر اتنے بڑے ہوم لینڈ کی صفائی ستھرائی کا معاملہ ہنوز برقرار تھا۔ اس مسئلے کو کیسے سلجھایا جائے۔ روزانہ پاپا کے آفس سے آنے کے بعد ایک ڈیڑھ گھنٹہ بحث میں گزرتا۔ موضوع وہ ہی ایک عدد نوکرانی کا حصول تھا۔ ایک دو کام والیاں نفیسہ آنٹی نے بھیجی بھی تھیں مگر شہرے نے تو انہیں دیکھتے ہی ریجیکٹ کر دیا تھا۔ ایک اتنی موٹی تھی کہ نہ جانے اپنا بوجھ لے چل پھر کیسے سکتی تھی کام کیسے کرتی۔ سیڑھیاں تو محترمہ چڑھ نہیں سکتی تھیں۔ ڈسٹنگ سے تخت الرجک بس کپڑے دھونے کے لیے بخوشی دو من کے سر کو ہلا دیا تھا۔ شہرے نے ناراضی سے "محترمہ" کو دیکھا اور جانے کا اشارہ کر دیا۔ دوسری کی طرف توجہ کی تو دل کو سخت ترین دھچکا لگا۔ یہ خاتون پہلی والی "کورنٹی" سے بالکل سائز میں مختلف تھیں۔ اتنی سوکھی سڑی، ہڈیوں کا ڈھانچہ سی، اس کی سوکھی لمبی گردن کی اور ہاتھوں کی وینز تک نظر آ رہی تھیں۔ خصوصاً" ہاتھوں کی وینز تو بہت ابھری ہوئی عجیب لگ رہی تھیں۔ اس کا سدا کا نرم دل دکھ کے احساس سے بھر گیا۔

"رتا تمہیں کھانے کو نہیں ملتا؟ جب تمہاری خوراک ہی مناسب نہیں، جسم میں جان تک نہیں تو کام کیسے کرو گی۔ میں اتنا ظلم تم پر نہیں کر سکتی۔ ہمارا اتنا بڑا گھر ہے تم تو ڈسٹنگ کرتے کرتے ہی آدھی ہو جاؤ گی اور باقی صفائی کرتے فوت ہو جاؤ گی۔ میں ایسا ظلم ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔ پلیز تم چلی جاؤ، یہ پیسے بھی رکھ لو۔ خوب کھاؤ پیو اور پھر کام کے بارے میں سوچنا۔"

رتا کو واپسی کی راہ دکھانے سے پہلے اپنی زیر نگرانی خوب اچھی طرح شاندار سا لنچ کروایا۔ کچھ کھانا بڑے سے ٹفن میں پیک کروا کے رتا کی خواہش کے مطابق اسے تھمایا اور جانے سے پہلے Ringgit کے ساتھ آٹھ نوٹ چپکے سے رتا کو پکڑا دیئے اور پھر بیرونی گیٹ تک چھوڑنے بھی آئی۔

دونوں کے جانے کے بعد وہ افسردہ سی ویلوٹ کے

صوفے میں دھنسی بیٹھی ریموٹ سے چینل سرچنگ میں مصروف تھی جب نفیسہ آنٹی چلی آئیں۔ یہ ان کے پڑوس میں عرصہ دراز سے مقیم تھیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی رحمہ اس کی کلاس فیلو اور فرینڈ تھی۔ دونوں کا زیادہ تر وقت اکٹھے گزرتا تھا۔ وہ بھی اسی کی طرح سیاحت کی شوقین تھی اور ان دونوں نے ایک ساتھ کئی ملک پاپا کے ہمراہ گھومے تھے۔ شہرے کے ہوم لینڈ کے لاؤنج سٹنگ روم اور بیڈ روم میں تمام دیواروں کے ساتھ مختلف خاص خاص مقامات کی تصویریں شان سے ٹنگی ہوئی تھیں۔ اکثر آنے والے اور پاپا کے فرینڈز خوب متاثر ہوتے کہ شہرے نے اتنی سی عمر میں نہ جانے کون کون سے ملک دیکھ رکھے ہیں۔ پاپا کے بغیر اس نے پندرہ سال کی عمر میں سفر کرنا شروع کیا تھا۔ وہ اسے بہت زیادہ بااعتماد اور بہادر دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ شہرے بہت اسٹرونگ ہو۔ بہت زیادہ مضبوط بن جائے بالکل فولاد کی طرح کہ زندگی کے سفر میں اسے ان کے بغیر اگر چلنا پڑے تو ان کی پیاری بیٹی کو نہ ٹھوکر لگے اور نہ ہی وہ تنہائی کے احساس سے گھبرا جائے۔

"شہری بیٹا! تم نے ریٹا کو بھی جواب دے دیا ہے۔" آنٹی کی آواز اسے سوچوں کے بھنور سے کھینچ لائی۔

"آنٹی! ریٹا کم از کم اس گھر میں کام کرنے کی اہل نہیں۔ وہ تو ایک بیمار اور کمزور چکن کی طرح لگتی ہے۔ آپ کوئی صحت مند "پیس" لا کر دیں۔" اس کے معصوم انداز کو ملاحظہ کر کے آنٹی نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"حسن بابا! آنٹی کے لیے کافی لائیں۔" اس نے ہانک لگائی تھی۔ کچھ پل بعد حسن بابا ٹرالی گھسیٹتے ہوئے آ گئے۔ آنٹی نے بغور خانساماں کا جائزہ لیا اور ان کے جانے کے بعد بولیں۔

"شکل سے ہی خرانٹ لگتا ہے۔ جمل ٹھیک تھا۔"

"کہاں ٹھیک تھا آنٹی!" وہ ایک دم الرٹ ہو گئی تھی۔ ایک پاؤں کارپٹ پر دوسرا صوفے پر اور گود میں کشن دبوچے وہ ان کو دونوں نوکروں کی "چوریوں" کے متعلق بتا رہی تھی۔

"پاپا کے والٹ سے پیسے چراتے تھے، کچن سے راشن دس دن کے اندر اندر ختم ہو جاتا تھا۔ فریج سے انڈے اور پھل نکال کر کھاتے تھے۔ سرف کے ڈبے اور شیمپو کی بوتلیں غائب ہونے لگی تھیں۔" شہری بہت جوش کے عالم میں بتا رہی تھی۔ اپنی عقلمندی کو سراہ رہی تھی اور نفیسہ آنٹی پہلو پہ پہلو بدل رہی تھیں۔ کافی کی طرف دیکھا تک نہیں۔

"یہ شہرے تو بہت چالاک ہے۔" نفیسہ نے تلخی سے سر جھٹکا اور شہد آگیں لہجے میں بولیں۔

"شہرے! تم تو بہت چھوٹی ہو۔ تمہیں لوگوں کی فطرت کا کیا پتا۔ بس اس بڈھے پر کڑی نگاہ رکھنا اور جلد فارغ بھی کر دینا۔ میں ایک بہت اچھے بٹلر کا انتظام کر رکھوں گی۔ گریجویٹ ہے۔ فر فر انگریزی بولتا ہے۔ اس "بابے" کی عربی پلس اردو کے مکسچر کی تمہیں کہاں سمجھ آتی ہو گی۔"

"نہیں آنٹی! میں اور پاپا حسن بابا سے مطمئن ہیں۔ آپ بس ایک عدد نوکرانی کا بندوبست کر دیں۔ صفائی تو میں کر لیتی ہوں پر کپڑے دھونا مشکل ہے۔" وہ کسی سمجھ دار خاتون خانہ کی طرح بات چیت کر رہی تھی۔ نفیسہ کو زہر لگ رہی تھی۔

"تمہارے اسکول کا ٹرپ دوحہ جا رہا ہے، رحمہ تو جائے گی۔ کیا تم نہیں جاؤ گی؟" آنٹی نے موضوع بدلا تو شہرے افسردگی سے بولی۔

"نہیں آنٹی! ایک تو پاپا کی طبیعت اچھی نہیں، دوسرا میرے جانے کے بعد ان کا کون خیال رکھے گا۔"

"اونہہ، ایک تم اور تمہارے پاپا۔" وہ جلتی بھنتی اٹھ گئی تھیں اور شہرے انہیں پکارتی رہ گئی۔

"حسن بابا! آنٹی نے کافی تو پی نہیں۔ چلیں میں اور آپ پی لیتے ہیں۔" وہ فل سائز کافی کا مگ اٹھا کر ایک مرتبہ پھر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یار شہری! تم بھی پروگرام بناؤ نا۔ اگر تم دوحہ جاؤ گی

تو میں جا سکوں گی۔ ہمیشہ تمہارے ساتھ ہی تو جاتی ہوں۔ میرے پاپا تو تم جانتی ہو اتنا مہنگا ٹرپ افورڈ نہیں کر سکتے۔" وہ اسکول کے سوئمنگ پول کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھیں جب رحمہ نے بہت لجاجت سے کہا تھا۔

"ام سوری رحمہ! شاید میں اس دفعہ نہ جا سکوں۔ نیکسٹ ٹائم دیکھوں گی۔" اس نے افسردگی سے بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے اور آہستگی سے بولی تھی۔ رحمہ کا منہ اتر گیا۔

"تمہاری پوری کلاس جائے گی میرے اور تمہارے علاوہ۔ ٹیچر "شہرے" بھی جا رہی ہیں۔" رحمہ نے اس کی فیورٹ ٹیچر کا لالچ دینا چاہا تھا مگر وہ نفی میں سر ہلانے لگی تھی۔

"تم انکل کی وجہ سے کہہ رہی ہو حالانکہ اب تو وہ ٹھیک ہیں۔"

"پاپا کو صرف ایزما ہی نہیں ہارٹ پرابلم بھی ہے اور...." شہرے کی آواز بھرا گئی تھی۔ کل پاپا کے ذاتی معالج انہیں چیک اپ کے لیے لے گئے تھے۔ واپسی پر پاپا بہت افسردہ اور پریشان تھے۔ اس کے بہت دفعہ پوچھنے پر بھی انہوں نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا مگر کل شام کو اس نے اسٹڈی کی دراز میں سے پاپا کی رپورٹس نکال لی تھیں۔ رپورٹس کے مطابق پاپا کو ڈائی بی ٹیز کی شکایت بھی ہو رہی تھی۔ اس شام شہرے بے حد روئی تھی۔ بہت چھوٹی سی عمر میں اسے کچھ کھو دینے کا خوف لاحق ہو گیا تھا۔ ممی کے بعد پاپا سے دائمی جدائی کا تصور بھی اس کی راتوں کی نیند اڑا دینے کے لیے کافی تھا۔ وہ رات رات بھر جاگتی رہتی تھی اور اٹھ اٹھ کر پاپا کے کمرے میں جھانکتی۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ ان کا خیال رکھتی تھی۔

"یہ تو نہیں مانے گی مجھے انکل سے بات کرنا چاہیے۔ آفٹر آل انہوں نے ہی تو میرے بھی جانے کے انتظامات کرنے ہیں۔" رحمہ نے سوچا اور پھر مزید دماغ کھپانے کا ارادہ ترک کر کے اٹھ گئی۔

اور پھر اگلے چار دن بعد شہرے نے دیکھا کہ پاپا نے پرنسپل کو انفارم کر کے اس کے اور رحمہ کے جانے کے تمام انتظامات کر دیے تھے۔ اس کی تمام ناراضی کا ایک جواب ان کے پاس موجود تھا۔

"میری بیٹی کا ایک ہی تو شوق ہے۔ میں اسے ہر صورت پورا کرنا چاہوں گا۔ اور پھر ورلڈ ریکارڈ بک میں شہری کا نام سیاحت کے حوالے سے دیکھنا میرا بھی جنون ہے۔" وہ شرارت سے کہہ رہے تھے اور شہری نے غصے سے پاؤں پٹخا اور اٹھ کر چلی گئی۔

اسے نفیسہ آنٹی اور رحمہ دونوں پر جی بھر کر تاؤ آ رہا تھا۔ مگر ہمیشہ کی طرح وہ نفیسہ آنٹی کے سامنے خود کو بے بس سمجھتی تھی۔

انکل عاجف پہلے پہل اس کے پاپا کی فوڈ فیکٹری میں جاب کرتے تھے۔ وہ لوگ بھی عرصہ دراز سے ملائشیا میں مقیم تھے۔ پاپا انکل کی تنخواہ کے علاوہ بھی ہیلپ کرتے تھے۔ پاکستانی ہونے کی وجہ سے انکل کی پوری فیملی پر پاپا کافی مہربان تھے۔ جب انکل نے جاب چھوڑی اور پھر اپنا ذاتی اسٹور بھی اسٹیبلش کر لیا تب بھی پاپا نے ان کے ساتھ تعلقات قائم رکھے تھے۔ پاپا کی مہربانی اور مالی ہیلپ کی وجہ سے انکل ان کے برابر میں بہت شاندار نہ سہی قدرے بہتر مکان لینے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

شہرے نے ہوش سنبھالتے ہی انکل، آنٹی کو اپنے گھر میں آتے اور بے تکلفی سے پورے گھر میں دندناتے دیکھا تھا۔ پاپا کی غیر موجودگی میں بھی وہ رحمہ کو لے کر آ جاتے تھے۔ انہوں نے پڑوسی ہونے کا حق بھی پورا پورا وصول کیا تھا۔ اکثر رحمہ رات کو بھی اس کے پاس رک جاتی۔ وہ فطرتاً "سیدھی سادی معصوم سی لڑکی تھی۔ رحمہ اس کے کھلونوں پر آرام سے قبضہ جما لیتی۔ اس کا ڈول ہاؤس بھی ہاؤس رحمہ کے بیڈ روم کی زینت بن چکا تھا۔ اکثر رحمہ کو اس کا بیگ یونیفارم اور شوز تک پسند آ جاتے اور پاپا نرمی سے اسے سمجھاتے۔

"شہری بیٹے! یہ بیگ آپ بہن کو دے دو، میں آپ کو اور لا دوں گا۔" شہری فوراً ہی پاپا کے حکم کی تعمیل کرتی تھی۔

رحمہ کا ایڈمیشن بھی اس کے اسکول میں ہو گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ کام بھی پاپا نے ہی کروایا ہو گا۔ اکثر آنٹی فیس جمع کروانے کی آخری ڈیٹ میں پاپا کے پاس آجاتی تھیں۔

"بھائی جان! شہری کے ساتھ رحمہ کی بھی فیس جمع کروا دیجیے گا۔ عاجف تو ان دنوں اسٹور میں خسارے کی وجہ سے پریشان ہیں۔ وہ تو رحمہ کو اسکول سے اٹھوانے کی بات کر رہے ہیں۔ مگر میرا دل نہیں مانتا۔" آنٹی اس قدر رقت بھرے لہجے میں کہتی تھیں کہ شہرے کا دل بھی پاپا کے ساتھ پسیج جاتا۔

ان کا ٹرپ دوحہ سے واپس آیا تو گھر میں ایک عدد ملازمہ چلتی پھرتی دیکھ کر شہرے کو خوشگوار جھٹکا لگا۔ یقیناً" آنٹی فون پر اسی سرپرائز کی بات کر رہی تھیں۔

"یہ امترا ہے بے چاری انڈیا سے آئی ہے۔ اس کا شوہر سات جھوٹے پھیرے لگوا کر دھوکے سے لے آیا تھا۔ ادھر ادھر دھکے کھاتی پھر رہی تھی۔ میں اسے لے آئی ہوں۔ کہو اچھا لگا میرا سرپرائز۔" آنٹی نے فخریہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تو وہ اثبات میں گردن ہلانے لگی تھی۔

امترا بیس اکیس سال کی حسین لڑکی تھی۔ بننے سنورنے کی حد درجہ شوقین۔ صرف پندرہ سال کی عمر میں شہرے کو اس کے رنگ ڈھنگ کھلنے لگے تھے اس نے بہت جلد "آگہی" کا سفر طے کر لیا تھا۔ شعور کی منزلیں بہت جلد عبور کر لی تھیں۔ وہ عورت کی بدلتی نگاہ کو جاننے لگی تھی۔ اور یہ تو بالکل سیدھی سادھی بات آئینے کی مانند نظر آ رہی تھی کہ امترا بیگم صفائی ستھرائی کی بجائے پاپا کو اکثر تاڑتی' چوری چوری دیکھتی پکڑی گئی تھی اور شہرے کا ایک دم اس سے بھی دل کھٹا ہو گیا۔

ایک دن وہ اسکول سے آئی تو محترمہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی میک اپ کر رہی تھیں اور پرفیوم کا استعمال بھی دل کھول کر کیا گیا تھا۔ شہرے کو دیکھ کر نہ جھجکی نہ گھبرائی بلکہ آرام سے کہنے لگی۔

"شہری جی! میں کیسی لگ رہی ہوں؟"

"بالکل چڑیل۔۔۔" شہری نے بھنا کر کہا تو وہ قل قل ہنسنے لگی تھی۔

"آپ بہت جولی اور سویٹ ہیں۔ اور میں بہت خوب صورت ہوں۔"

اس نے غصے سے کہا تھا مگر امترا پر قطعاً" اثر نہ ہوا۔ وہ اپنا میک اپ چھوٹے سے بیگ میں ڈالنے لگی تھی۔ شہری نے حیرت سے پہلے میک اپ اور پھر بیگ کو دیکھا۔ یہ ایک امپورٹڈ بیگ تھا۔

"کس نے لے کر دیا ہے یہ بیگ؟" شہری نے مشکوک انداز میں گھورا تو وہ گڑبڑا کر بولی تھی اور پھر ایک دم دانتوں تلے زبان داب لی۔

"نفیسہ جی نے۔"

"آنٹی نے؟" شہری کو حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ وہ خفگی سے اسے جھاڑتی ہوئی آنٹی کی طرف آ گئی تھی۔ وہ کچن میں کھڑی تھیں۔ فون کانوں سے لگا رکھا تھا۔ ان کی آواز باہر تک آ رہی تھی۔

"ہاں ہاں کام ہو جائے گا۔ یہ شہری بڑی بھولی سی چیز ہے۔ [illegible] ہنڈرڈ پرسنٹ ہو گا۔ بس تھوڑا سا انتظار کرو۔" شہری نے نا سمجھی کے عالم میں ان کی دو چار باتیں سنی تھیں اور پھر کچن میں داخل ہو گئی۔ آنٹی اسے دیکھ کر قدرے بوکھلا گئی تھیں۔ فون سرعت سے ٹیبل پر پٹخا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"کب آئی ہو شہری؟"

"ابھی چند منٹ پہلے۔" اس نے لاپروائی سے کہا تھا۔ آنٹی نے بغور اس کا چہرہ دیکھا تھا اور پھر مطمئن سی ہو گئیں۔

"رحمہ اپنے کمرے میں ہے۔"

"مجھے آپ سے کچھ بات کرنا تھی۔" وہ ایک چھوٹا سا امرود باسکٹ سے اٹھا کر ان کے پیچھے لاؤنج میں چلی آئی تھی۔ آنٹی ایک دفعہ پھر چونک سی گئیں۔

"کون سی بات؟" ان کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔

"امترا کے بارے میں۔" وہ دھپ سے صوفے پر بیٹھ گئی تھی اور کشن کو اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔

"کیا تم اس کے کام سے مطمئن نہیں ہو۔" آنٹی

نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

"نہیں، کام تو وہ ٹھیک کرتی ہے۔ مگر آنٹی مجھے اس کی عادتیں پسند نہیں۔ اتنا میک اپ تھوپے رکھتی ہے۔ ہر وقت گنگناتی پھرتی ہے۔ مجھے تو نہیں لگتا اس کے ساتھ کوئی فراڈ ہوا ہو گا بلکہ وہ تو خود شکل سے "فراڈن" لگتی ہے۔" اس نے اپنی الجھن کا اظہار بغیر جھجکے کر دیا تھا۔ بس پاپا کو "تاڑنے" والی بات گول کر دی تھی۔ اس بات سے شہرے کو اپنی اور پاپا کی انسلٹ فیل ہو رہی تھی لہٰذا آرام سے چھپا گئی تھی ورنہ امترا کی حرکتیں نظر انداز کی جانے والی نہیں تھیں۔ آنٹی نے توجہ سے اس کی بات سنی اور پھر رسان سے بولنے لگیں۔

"میک اپ کرتی ہے۔ خود کو صاف ستھرا رکھتی ہے یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ورنہ کام والیاں تو بہت گندی ہوتی ہیں۔ صفائی کروانے کو دل نہیں مانتا۔"

"وہ آئندہ مسٹری بن کر ہمارے گھر میں نہیں آئے گی۔ آپ اسے سمجھا دیجیے گا۔" شہری نے ناگواری سے کہا تو نفیسہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھیں۔

"کس قدر ہوشیار لڑکی ہے۔ ہر چیز پر اتنی گہری نظر۔ سو سالہ بڈھی روح سما چکی ہے اس کے اندر۔ ایک رحمہ ہے انتہائی احمق اور بے عقل۔ کسی بات کا ہوش نہیں اور یہ شہری اس کا تو مجھے کوئی مضبوط بندوبست کرنا ہو گا۔" انہوں نے دل ہی دل میں پکا فیصلہ کر لیا تھا۔ بس اس کے فائنل ایگزامز کا انتظار تھا پھر اسے ہائیر اسٹڈیز کے لیے لندن جانا تھا ہر صورت ہر قیمت پر۔ اپنے راستے کی اس سب سے بڑی رکاوٹ کو ہٹانے کا وہ پورا پورا منصوبہ بنا چکی تھیں۔

اگلی شام پاپا اسے ڈنر کروانے باہر لے گئے تھے۔ یہ ایک عربین ریسٹورنٹ تھا۔ اس نے اپنی فیورٹ ڈشز میں کوفتہ بریانی' پودینے اور ٹماٹر کی چٹنی کے ساتھ لیموں کا اچار منگوایا تھا۔ آرڈر نوٹ کرواتے ہوئے اس کے منہ میں ڈھیروں پانی بھر آیا تھا۔ پاپا اس کی بے تابی نوٹ کر کے مسکرا رہے تھے خود وہ پرہیزی کھانا کھاتے تھے۔

رات سے انہیں کچھ فیور بھی محسوس ہو رہا تھا اسی لیے انہوں نے اپنے لیے صرف پورج کا آرڈر دیا تھا۔ کھانے کے دوران پاپا نے اس سے ایگزامز کی تیاری کے متعلق پوچھا۔

"پاپا! میں پورا سلیبس حفظ کر چکی ہوں۔" اس نے سوں سوں کرتے ہوئے بتایا تھا۔

"کس کالج میں جانے کا ارادہ ہے؟" انہوں نے لائم جوس کا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔

"اس بارے میں بھی آپ بہتر جانتے ہیں۔" شہری نے گلاس لبوں سے لگا کر ان کے مان کو بھی بڑھا دیا تھا۔ ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔

"آج صبح تم اسکول جب گئیں تو نفیسہ بھابھی اور عاجف آ گئے تھے۔ ایسے ہی باتوں باتوں میں تمہاری آئندہ پڑھائی اور فیوچر کے بارے میں پوچھنے لگے۔ بھابھی بتا رہی تھیں کہ تمہاری خواہش ہے لندن کے انسٹی ٹیوٹ میں پڑھنے کی۔ اگر تم لندن جانا چاہتی ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ یہاں تمہاری اسکولنگ ملک کے سب سے بڑے اسکول سے ہوئی۔ تمہارا پچھلا ریکارڈ بھی شان دار ہے۔ ایڈمیشن ملنا مشکل نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری بیٹی بہترین اداروں سے اعلا تعلیم حاصل کرے۔" انہوں نے نیپکن سے ہاتھ صاف کیے اور پھر بغور سوچوں میں گم شہرے کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ جس کی توجہ کھانے سے ہٹ چکی تھی۔

"پہلے لندن جانے کی خواہش تھی مگر اب نہیں۔" کافی دیر سوچنے کے بعد وہ آہستگی سے بولی۔

"کیوں بیٹا!" انہوں نے حیرانی سے پوچھا تھا اور پھر کچھ سمجھ کر سر ہلانے لگے۔

"میری وجہ سے کہہ رہی ہو۔ مگر میں اب بالکل فٹ کو محسوس کر رہا ہوں۔ تمہیں بہت آگے جانا ہے شہرے بہت سا پڑھنا ہے' اپنا ایک الگ مقام بنانا ہے۔ میں چاہتا ہوں تم گریجویشن کر لو اور پھر میں پاکستان ہمیشہ کے لیے تمہیں لے کر چلا جاؤں گا۔ اس

ضمن میں قاسم سے بھی بات کر چکا ہوں میں۔ اپنا بزنس وائنڈ اپ کرلوں گا۔ تم تعلیم مکمل کرلو پھر سب کچھ تم ہی کو سنبھالنا ہے۔ میں اب تھکنے لگا ہوں شہرے! اگر تم نہ ہوتیں تو باسمہ کے بعد میں نے خود کو ختم کرلیتا۔ اس کے بغیر زندگی میں میرے لیے کوئی رنگ نہیں بچا۔"

"پاپا..." شہرے نے اپنے دونوں ہاتھوں سے ان کا چہرہ تھاما اور پھر ان کے شانے سے سر ٹکا کر رودی۔ انہوں نے کبھی ممی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ شاید اسی لیے کہ وہ شہرے کو کسی محرومی کا احساس دلانا نہیں چاہتے تھے۔

"پاکستان مگر کیوں پاپا!" کچھ دیر سوچنے کے بعد شہرے نے حیرانی سے پوچھا۔

"پاکستان میں ہمارا کون ہے؟"

"میرے نہ سہی مگر تمہارے وہاں بہت سے رشتے موجود ہیں۔" انہوں نے آہستگی سے کہا تھا اور پھر بل پے کرکے اٹھ گئے۔ گھر جانے کی بجائے وہ دونوں واک کرتے ہوئے قریبی پارک میں آگئے تھے۔ اس وقت پارک سنسان تھا۔ پاپا ایک بینچ پر بیٹھ چکے تھے۔

"پاپا میں سمجھی نہیں۔" اس نے الجھ کر انہیں کچھ یاد دلانا چاہا۔

"تم کچھ نہیں جانتیں شہرے! میں تمہیں آج کچھ باتیں بتانا چاہتا ہوں۔ سمجھانا چاہتا ہوں۔" وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے نہ جانے کیا کھوج رہے تھے۔

"میری اور تمہاری ممی کی لو میرج تھی۔ وہ پاکستان سے یونی ورسٹی ٹرپ کے ساتھ آئی تھی۔ ہماری ملاقات ایئرپورٹ پر ہوئی تھی۔ اس ایک ملاقات نے اس دیوانی سی لڑکی کو میرا گرویدہ بنادیا تھا۔ وہ مجھے چاہنے لگی تھی اور میں بھی... مختصر یہ کہ ملائشیا سے واپسی پر کچھ خواب آنکھوں میں لے کر وہ اس سرزمین کو چھوڑ گئی تھی۔

صرف چند ماہ بعد اس نے میرے ساتھ پھر سے رابطہ کیا تھا۔ وہ اپنے پیرنٹس کو منانے میں ناکام ہوگئی تھی۔ اسے بڑا یقین تھا کہ وہ اپنے پاپا کو منالے گی مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوسکا۔ کچھ عرصہ مزید گزرا کہ ایک دن آفس میں مجھ سے ملنے ایک ویل ڈریسڈ سا مہذب نوجوان آیا۔ وہ کراچی سے آیا تھا۔ اس کا نام اسفندیار تھا اور وہ باسمہ کا بڑا بھائی تھا۔

وہ مجھ سے ملا تھا بہت تپاک سے۔ تین دن وہ میرے ساتھ رہا تھا اس نے مجھے یقیناً "اندر تک جانچا پرکھا اور پھر مطمئن ہوکر اپنے آفس کا ایڈریس دے کر چلا گیا تھا۔ کراچی میں ان کی کئی فیکٹریاں تھیں۔ ان کا بہت بڑا بزنس تھا۔

صرف چند دن بعد وہ دوبارہ آگیا تھا مگر اس دفعہ وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ باسمہ بھی تھی۔ ہوم لینڈ میں ہمارا نکاح ہوا تھا۔ اسفندیار نکاح کے فوراً" بعد چلا گیا تھا اور باسمہ ہمیشہ کے لیے میری ہوگئی۔

ہم نے بہت اچھا اور خوشگوار وقت گزارا تھا۔ تمہاری آمد نے ہماری خوشیوں کو دوبالا کردیا۔ مگر پھر نہ جانے کس کی نظر ہمارے آشیانے کو بکھیر گئی تھی۔ باسمہ کی اچانک ڈیتھ نے مجھے نیم پاگل کردیا تھا۔ میری دنیا تاریک ہوگئی تھی۔ اور میں کئی دن ہسپتال میں پڑا رہا۔" پاپا بولتے بولتے ایک دم خاموش ہوگئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"پاپا! آپ نے ممی کی ڈیتھ کی خبر ان کی فیملی کو نہیں دی تھی؟" وہ بے حد رنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

"میں نے انہیں اطلاع کردی تھی۔ اس کے پانچوں بھائی اور ماں باپ شام کی فلائٹ سے پہنچ چکے تھے۔ باسمہ کی بھابھیاں بھی آئی تھیں۔ وہ اپنی فیملی میں سب سے چھوٹی تھی۔ اور سب کی بے حد لاڈلی بھی۔ میں نے سب سے زیادہ اسفندیار کو روتے دیکھا تھا۔ اسے باسمہ سے بہت محبت تھی اور یہی محبت اپنا آپ منوا کر اسفندیار کو ملائشیا کھینچ لائی تھی۔ وہ مجھ سے ملنے آیا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور باسمہ کی پسند کو سراہا بھی۔ اور پھر نہ جانے کن طوفانوں سے گزر کر وہ باسمہ کو میرے پاس لے کر آیا تھا۔

وہ باسمہ کو پاکستان لے کر جانا چاہتے تھے اپنے خاندانی قبرستان میں دفن کرنے کی غرض سے۔ میں نے ان کی بات مان لی میں کچھ کہنے کی پوزیشن میں تھا بھی نہیں۔ وہ واپس جارہے تھے باسمہ تابوت میں بند تھی اور میرا دل کرلا رہا تھا۔

اس رات تین بجے میں بھی پاکستان آگیا تھا۔ پانچ بجے باسمہ کو دفن کردیا گیا اور اگلی شام باسمہ کی ممی نے مجھے اور تمہیں گھر سے نکال دیا۔

وہ مجھے باسمہ کا قاتل سمجھتی تھیں۔ شاید صدمے کی وجہ سے وہ مجھے گالیاں دے رہی تھیں۔ میں نے ان کی تمام تر گالیاں بخوشی سنی تھیں۔ میں ان کے "غم" کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ اسفندیار نہ جانے کہاں تھا اور پھر میں اپنا سب کچھ پاکستان کی مٹی میں دفن کرکے لٹا پٹا سا واپس آگیا۔" پاپا خاموش ہوئے تو وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"انہوں نے پھر آپ سے کوئی رابطہ نہیں رکھا۔ مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔"

"نہیں! شاید باسمہ کے بعد مجھ سے رابطہ رکھنے کی خود میں ہمت نہیں کرسکتے تھے اور پھر تم سے ملتے۔" پاپا نے تھکے تھکے لہجے میں کہا تھا۔ اور پھر اس کا ہاتھ نرمی سے دباتے ہوئے بولے۔

"اس دراز میں سے البم نکال کرلاؤ۔"

"ممی کی تصویریں۔" وہ ایک دم پرجوش سی ہوکر اٹھ گئی تھی بڑا سا بھاری بھر کم البم نکال کر وہ پاپا کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔ پندرہ سالوں میں پہلی مرتبہ اس نے اپنی ماں کی تصویریں دیکھی تھیں۔ اس گھر کی کسی دیوار پر ممی کی کوئی تصویر نہیں تھی۔ پاپا اسے ہر غم اور ہر صدمے سے بچانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس کی ماں کی ہر یاد کو دل کے نہاں خانوں میں محفوظ کر رکھا تھا۔

"پاپا! میں ممی جیسی ہوں نا؟" اس نے ایک ہاتھ سے تصویر کو پکڑا اور دوسرا ہاتھ اپنے چہرے کے نقوش پر پھیرتے ہوئے چہک کر بولی۔

"ہوں..." انہوں نے ہنکارا بھرا اور بولے۔

"تم اپنی ممی جیسی ہو۔ اگر تم اسفندیار کے سامنے جاؤگی تو وہ تمہیں پہلی نظر میں پہچان لے گا۔" وہ اسے بتارہے تھے۔ کچھ ماضی کی خوشگوار باتیں یادیں۔

"یہ اسفندیار ہے اس کی اور باسمہ کی محبت مثالی تھی۔" پاپا نے ایک تصویر اس کے سامنے نکال کر رکھی تھی۔ اس نے بغور اپنی ممی کے بھائی کو دیکھا تھا ایک مرتبہ دو مرتبہ اور پھر کئی مرتبہ۔ ان کا ایک ایک نقش اسے ازبر ہوچکا تھا۔ شہرے نے آنکھیں بند کیں اور اسفندیار کی تصویر اس کی نگاہوں کے پار اتر گئی۔ اسے ایک فطری سی بے تحاشا محبت اس وجود سے محسوس ہورہی تھی۔ اسفندیار اس کی ممی کے بھائی تھے۔ اس کی ممی کے ہمراز دوست... ممی اور پاپا کی محبت کو پایہ تکمیل تک پہنچانے والے۔ اس کی آنکھیں عقیدت اور محبت کے احساس سے لبریز ہوچکی تھیں۔

اس نے بے ساختہ تصویر کو چوم لیا تھا۔ وہ اس ایک چہرے کو قریب سے دیکھنے اور ملنے کے لیے بے تاب تھی مگر بیچ میں بہت لمبا، طویل سفر اور دوریاں موجود تھیں۔ ان فاصلوں کو پاٹنا تھا۔ نانا نانی سے ملنا تھا اگر کچھ رنجشیں تھیں تو انہیں دور کرنا تھا مگر کیسے؟

اگلے بہت سارے دن مصروفیت کی نذر ہوگئے تھے۔ ایگزامز شروع ہوئے اور پھر ختم بھی ہوگئے۔

پاپا اسے لندن بھیجنے کا پروگرام بناچکے تھے۔ شہرے کا رونا، دھونا چیخنا، چلانا، فریادیں کرنا سب بے کار گیا۔ پاپا نے اس کی بھوک ہڑتال پر بھی توجہ نہیں دی تھی۔

"شہرے! تم میری وجہ سے اپنی دیرینہ خواہش کا گلا مت گھونٹو میری بیٹی!" اور پھر وہ پاپا کے آنسوؤں کے سامنے ہار گئی تھی۔ اس کی خاموشی نے سب سے زیادہ نفیسہ آنٹی اور رحمہ کو خوش کیا تھا۔

وہ لندن پہنچ چکی تھی۔ وقت دھیرے دھیرے سرکنے لگا۔ دو سال چپکے سے گزر گئے۔ شہرے ان دو سالوں میں چار مرتبہ پاپا سے ملنے گئی تھی ایک مرتبہ وہ خود اس کے پاس چلے آئے تھے۔ وہ بہت الجھے الجھے پریشان سے تھے۔ شہرے نے بہت ضد کی تھی ان کے ساتھ جانے کی مگر پاپا نہیں مانے تھے۔ وہ بہت

چپ چپ سے رہنے لگے تھے۔ فون پر روز بات ہوتی تھی مگر شہرے ان کے رویے انداز اور لب و لہجے سے کچھ بھی اندازہ نہیں کر سکی تھی۔

پاپا پریشان تھے اسے بس اتنا ہی معلوم ہو سکا تھا کیوں؟ کیا وجہ تھی۔ کون سا مسئلہ تھا پاپا اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔

ان دنوں اس کی ساری توجہ پڑھائی پر تھی۔ فارغ اوقات میں وہ کتابیں پڑھتی تھی یا پھر گھومتی پھرتی۔

اس نے انسٹی ٹیوٹ آف بزنس ایڈ منسٹریشن لندن سے بی بی اے کرلیا تھا۔ اس دوران اس نے اپنے سیاحت کے شوق کو بھی خوب پورا کیا۔

کئی ملکوں کی سیر کی۔ سوئٹزرلینڈ کے جینوا اور برن کے علاوہ شنگھائی 'قاہرہ' تیونس' مصر اور یو ایس اے کئی ممالک گھومے تھے۔

اس نے قدیم دنیا کے کئی عجائبات مثلاً "زیئس کا مجسمہ' رہوڈز کا مجسمہ' ڈیانا کا مندر' اسکندریہ کا روشنی کا مینار کے متعلق سن رکھا تھا۔ زلزلوں نے انہیں تباہ کر دیا تھا۔ روم کا محل' تاج محل آگرہ اور بادشاہی مسجد دیکھنے کی چاہ اور فیصل مسجد کو دیکھنے کی جستجو ہے لندن میں چھ سال گزارنے کے بعد اپنے وطن ملائشیا آئی تھی۔ اس کے سامان میں کئی سوٹ کیس تھے اور کچھ بہت بڑی بڑی پیکنگ میں لپٹی پینٹنگ تھیں جو کہ اس نے رحمہ کے لیے خریدی تھیں۔ کچھ مختلف مقامات کی فل سائز فریم شدہ تصویریں تھیں۔ اس میں ایک ہیلی کارنے سس کے مقبرے اور دوسری ریاست میسوری کے مقام سینٹ لوئیس میں واقع محراب کے اسٹیل لیس اسٹیل سے بنے دروازے کی تصویریں تھیں جو کہ اس نے اپنے ڈرائنگ روم میں سجائی تھیں۔ اس گولائی دار محراب کی تصویر پہلی نظر میں رحمہ کو پسند آگئی تھی مگر اب وہ پہلے والی شہرے نہیں تھی جو اپنی پسندیدہ چیز خاموشی سے رحمہ کے حوالے کر دیتی۔

بیچ میں چھ سال کا عرصہ موجود تھا۔ ان چھ سالوں میں وہ چند ایک بار ہی آنٹی اور رحمہ سے مل سکی تھی۔

ایم بی اے کے دوران پاپا ہر چھ ماہ بعد خود اس سے ملنے آجاتے تھے۔ وہ جب بھی لندن آتے شہرے کے پاس تین چار ماہ ضرور رہتے۔ اس دوران شہرے اکثر حیران ہو کر پوچھتی تھی کہ فیکٹری کی دیکھ بھال کون کرتا ہے اور پاپا پھیکے سے انداز میں مسکرا کر کہتے۔

"عاجف ہے نا۔"

"مگر پاپا! عاجف انکل کا تو اپنا بزنس ہے ان کے ذاتی اسٹور ہیں اور وہ تو خود کافی مصروف ہوتے ہیں پھر فیکٹری کے لیے ٹائم کیسے نکالتے ہیں۔" شہرے الجھ کر پوچھتی۔

"فیکٹری کے لیے اس کے پاس بہت وقت ہوتا ہے۔" وہ سپاٹ انداز میں کہہ کر اسے مزید الجھا دیتے تھے۔

"پاپا! میں سمجھی نہیں۔"

"جن دنوں عاجف مالی بحران کا شکار تھا۔ میں نے اس کی بہت مدد کی تھی یہ اسی ہمدردی کا رزلٹ ہے۔"

ان کی مبہم گفتگو شہرے کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ مگر ایک تو اسے پہلے یقین ضرور ہو چکا تھا کہ پاپا بے حد پریشان رہنے لگے ہیں۔ کیا وجہ تھی؟ آج اس نے ہر بات جاننے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

"ایک چیز ہوتی ہے ایکسپلوریشن' کچھ پانے کی جستجو کرنا اس کے لیے آپ کے سامنے کئی سمتیں ہوتی ہیں۔ ان کا تعین آپ کو خود کرنا پڑتا ہے۔ یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ اچھے یا برے' سیدھے یا الجھے کس راستے کا انتخاب کرتے ہیں۔ بعض لوگ زندگی کی آسائشات اپنے زور بازو' محنت اور لگن سے حاصل کرتے ہیں اور بعض لوگ کسی نہ کسی شارٹ کٹ کے انتظار میں ہوتے ہیں۔ وہ موقع کی تلاش میں ہوتے ہیں جب بھی ان کو پرافٹ ایبل موقع قدرت صرف اور صرف آزمائش کے لیے فراہم کرتی ہے یہ لوگ اپنے معیار سے فوراً گر جاتے ہیں۔ ایکچوئلی ایسے لوگ خود اپنے ہاتھوں سے پستی کا انتخاب کرتے ہیں۔ تمہارے عاجف انکل اسی کیٹیگری میں آتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہیں دوران تعلیم مینٹلی اپ

سیٹ کروں مگر کچھ باتیں تمہارے علم میں لانا بے حد ضروری ہیں۔ بیٹا! تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ابھی میں زندہ ہوں' وہ مفاد پرست لوگ کچھ بھی نہیں کرسکتے۔ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں صرف تمہاری تعلیم مکمل ہونے کا انتظار کر رہا ہوں۔ پھر فیکٹری فروخت کرنے کے بعد تمہیں پاکستان تمہارے اپنوں کے پاس بھجوا دوں گا۔ وہ لوگ پاسمہ سے بہت محبت کرتے تھے۔ یقیناً" اس کی اکلوتی بیٹی' اس کی آخری نشانی کو ضرور سینے سے لگالیں گے۔" پاپا خاموش ہوئے تو وہ بے اختیار سسکنے لگی تھی۔ زندگی کا ایک یہ بھی کریہہ روپ نظر آگیا تھا۔ جن لوگوں کے لیے اتنی قربانیاں دیں' محبت دی وہ ہی آستین کے سانپ نکلے تھے۔ انہوں نے پاپا کو تنہا اور بیمار جان کر پیٹھ پیچھے خنجر گھونپ دیا تھا۔ اس رات زندگی میں پہلی مرتبہ وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی تھی اور تکیہ بھگوتی رہی۔

☼ ☼ ☼

پاپا ہمیشہ کی طرح دو ماہ مزید اس کے پاس رہے تھے۔ ان کے لیے طویل سفر نقصان دہ تھا مگر وہ اپنی تکلیف بھلائے محض اس کو الجھنوں سے بچانے کی غرض سے خود چلے آتے تھے۔ یہاں ایک ڈاکٹر سے وہ اپنا علاج بھی کروا رہے تھے۔ موجودہ میڈیسن اور چیک اپ کی وجہ سے نتیجہ کافی تسلی بخش تھا۔

پاپا کے جانے کے بعد وہ کئی دن ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہی تھی۔ رات رات بھر جاگتی رہتی اور سوچتی رہتی۔ اس کی روم میٹ انجلی بھی اس کی روٹین سے کافی حیران تھی۔ کہاں تو صرف پڑھائی کے علاوہ اسے کچھ سوجھتا نہیں تھا اور اب وہ کتابوں کو ہاتھ بھی نہیں لگا رہی تھی۔ یونی ورسٹی کا سالانہ ٹرپ برونائی جا رہا تھا۔ شہرے کے انکار نے انجلی کو حیران کر دیا تھا۔ مگر وہ بہت بے تکلفی ہونے کے باوجود شہرے سے کچھ پوچھنے کی جرأت نہیں کر سکی تھی۔

یہ کیفیت چند دنوں تک اس پر اس طرح طاری رہی تھی کہ اس نے کھانا پینا بھی چھوڑ رکھا تھا۔ دراصل وہ ابھی تک "شاک" کے عالم میں تھی۔ اسے شاید انکل سے اس درجہ گر جانے کی توقع نہیں تھی۔

اگلی مرتبہ پاپا کچھ جلدی اس سے ملنے آگئے تھے۔ ان کی دوائیاں بھی ختم ہو چکی تھیں۔ شہرے سب سے پہلے انہیں چیک اپ کی غرض سے ڈاکٹر کے پاس لے آئی۔

"آپ اپنی ڈائٹ کا خیال کیوں نہیں رکھتے۔" ڈاکٹر نے پہلی نظر میں ان کی گرتی صحت کو تشویش بھری نگاہ سے دیکھا تھا۔

پاپا نے ڈاکٹر کو مطمئن کرنے کے لیے نہ جانے کیا کہا تھا مگر شہرے خود ان کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ نئے سرے سے چیک اپ ہوا تھا۔ مختلف قسم کے ٹیسٹ کروائے گئے تھے۔ تین بجے تک رپورٹس ملیں' جب تک اس نے خود اپنی آنکھوں سے رپورٹس نہیں پڑھ لی تھیں تب تک اسے چین نہیں آیا تھا۔ رپورٹس پہلے سے بہتر تھیں بس ویک نیس کافی زیادہ تھی۔ شہرے نے ہمیشہ کی طرح پاپا کے ساتھ واپس جانے کی ضد کرنا شروع کردی تھی۔

"صرف چند ماہ تو رہ گئے ہیں۔ فائنل ایگزامز کے بعد تم میرے پاس آجاؤ گی۔" وہ اسے بہلا پھسلا کر ایک دفعہ پھر قائل کر چکے تھے اور اس کی تمام نصیحتیں ملائشیا تک ان کے ساتھ ساتھ تھیں۔

"پاپا! اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ میں آپ کو بہت مس کرتی ہوں مگر مجبور ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ بہت سا پڑھانا' میرے نام کے آگے کچھ ڈگریوں اور میڈلز دیکھنا آپ کا دیرینہ خواب ہے۔ میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی۔" وہ آنسو بھری نگاہیں ہاتھوں کی پشت سے مسلتی زیر لب بڑبڑائی تھی۔ انجلی کب سے اسے روتے ہوئے اور زیر لب کچھ نہ کچھ بڑبڑاتے دیکھ رہی تھی۔ جب رہا نہ گیا تو بول اٹھی۔

"تم اپنے پاپا کو مس کر رہی ہو شہرے!"

"ہوں۔" اس نے تکیے پر سر رکھا اور آنکھیں موند لیں۔

"ایک بات پوچھوں' مائنڈ تو نہیں کرو گی؟" انجلی

کافی کے مگ کو ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں کار ڈ کیز تھا۔ یقیناً" وہ کسی نئے فرینڈ سے ملاقات کرنے جا رہی تھی۔ اسے روتا دیکھ کر رک گئی اور پھر کچھ سوچتے ہوئے اپنے لیے کافی بنا لائی۔ یقیناً" اس کا شہرے سے لمبی گفتگو کا ارادہ تھا۔

"بولو 'تمہیں یہ بات سن کر حیرانی ہوگی کہ مجھے اتنی جلدی غصہ نہیں آتا۔ میں نہایت سوچ سمجھ کر غصہ کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ یہاں تک کہ میرا غصہ ناراضی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی ہے۔" اب وہ آنکھیں کھولے سامنے دیوار کو دیکھ رہی تھی۔ انجلی نے غور کیا۔ شہرے حسین لڑکیوں میں شمار ہوتی تھی۔ اس کی آنکھیں اس وقت رونے کی شدت کی وجہ سے بے حد گلابی ہو رہی تھیں۔ بلاشبہ وہ بہت حسین لڑکی تھی۔ انجلی نے دل ہی دل میں اسے سراہا اور بولی۔

"تمہارا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہے؟"

"تم نے یہ بات کیوں سوچی اور پوچھی؟" شہرے نے بھی الٹا سوال داغ دیا تھا۔ انجلی بالوں کو پونی میں جکڑتے ہوئے لاپروائی سے بولی۔

"میں نے تمہیں اتنے سالوں میں تنہا دیکھا ہے۔ آفٹر آل ہم پچھلے ساڑھے پانچ سال سے ایک ہی کمرے کو شیئر کر رہی ہیں۔"

"مجھے بوائے تو کیا گرل فرینڈز سے بھی چڑ ہے۔ بلکہ میری کوئی دوست نہیں ہے۔ بس ایک رحمہ تھی مگر اب وہ بھی نہیں۔" اس نے جلتی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر ہولے سے دبایا۔ وہ سلگتے آنسو گالوں پر لڑھک آئے تھے۔

"چیپ لوگ۔" اس نے تنفر سے سوچا۔

"کیا تمہاری کسی کے ساتھ کمٹ منٹ ہے۔"

ایک اور پرسنل سوال۔ شہرے نے پوری آنکھیں کھول لی تھیں۔ انجلی اپنے کام سے کام رکھنے والی لڑکی تھی مگر آج وہ اسے حیران کرنے کا پروگرام بنائے بیٹھی تھی۔ اتنے سالوں میں پہلی مرتبہ وہ شہرے کے پرسنل ڈسکس کر رہی تھی۔ کیونکہ اسے بوائے فرینڈز کی قربتوں سے فرصت ہی کہاں ملتی تھی کہ وہ ادھر ادھر دیکھتی۔

"نہیں۔" شہرے نے صاف گوئی سے جواب دیا تھا۔ انجلی کچھ بدمزہ سی ہو گئی۔

"تم حسین ہو' دولت مند ہو اور پھر اکلوتی بھی۔ کیا آج تک تمہیں کسی نے پرپوز نہیں کیا؟ دوستی کی آفر نہیں کی؟ تم شروع سے ہی کو ایجوکیشن میں پڑھتی رہی ہو۔"

"خوبصورت اور دولت مند ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اپنی نسوانیت کو مٹی میں رول دیا جائے۔ سوسائٹی میں پیرنٹس کی عزت پر کیچڑ اچھالنے کا اہتمام کیا جائے۔ میرے پاپا نے میری تربیت کچھ ایسے خطوط پر کی ہے کہ میں ان باتوں کو دوسروں کے لیے ناپسند کرتی ہوں۔ کجا کہ خود بھی ایسی نازیبا حرکتوں میں ملوث ہو جاؤں۔" شہرے نے ناگواری سے اسے بہت کچھ جتا دیا تھا۔

"تم صرف اپنے پاپا کی بات کرتی ہو' کیا ممی نہیں ہیں یا پھر تمہارے ممی پاپا کی علیحدگی ہو چکی ہے؟" انجلی نے شہرے سے کہا تھا۔ شہرے کی آنکھیں پھر سے نم ہونے لگیں۔

"میری ممی کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔ وہ بہت سویٹ مدر تھیں۔"

"او ہو' ویری سوری شہرے! میں نے تمہیں دکھی کر دیا۔" انجلی نے مصنوعی تاسف سے کہا تھا۔

"اٹس او کے۔" وہ آنسو پونچھ کر بولی۔

"تم کہیں جا رہی ہو؟" شہرے کی نگاہ اب اس کی تیاریوں پر پڑی تھی اسی لیے حیرانی سے دیکھنے لگی۔

"گولڈی سے ملنے جا رہی ہوں۔ کچھ آؤٹنگ کا پروگرام ہے۔ اگر تم بھی آنا چاہو تو۔" انجلی کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی اور شرارت سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"گولڈی کے فرینڈ بنٹی سے فرینڈشپ کروا دوں۔ تمہیں بھی زندگی کا لطف آ جائے گا۔" انجلی نے عامیانہ انداز میں آنکھ ماری تو وہ ناگواری سے سرخ پڑ گئی۔

"یہ دوستیاں آپ کو ہی مبارک ہوں۔" اس نے تنفر سے کہا تھا اور پھر تکیہ منہ پر رکھ لیا۔ انجلی ٹک ٹک کرتی ہنستی کھلکھلاتی چلی گئی تھی۔ شہرے کی ذہنی رو پھر سے بھٹک گئی۔ اس کا دل سینے میں پھڑپھڑا رہا تھا اور اپنے ہوم لینڈ کی طرف اڑنے کے لیے بے تاب تھا۔ پاپا کی تنہائیوں کے احساس نے ایک مرتبہ پھر اس کی آنکھوں کو بھگو ڈالا تھا۔ اسی پل فون کی گھنٹی گونج اٹھی۔ دوسری طرف امترا تھی۔ جو اس کے واپس آنے کی بابت پوچھ رہی تھی۔

"شہری جی! آپ کب آئیں گی؟"

"کیوں؟ تم اداس ہو گئی ہو؟" شہرے نے چڑ کر کہا۔

"تو اور کیا جی' گھر میں رونق ہی نہیں ہے۔" وہ سادگی سے بولی۔

"حسن بابا کیسے ہیں؟" اس نے اپنے خانساماں کے بارے میں پوچھا تھا۔

"وہ تو جی نوکری چھوڑ کر جا چکے ہیں۔" امترا نے اطمینان سے بتایا تو شہرے حیران پریشان ہی رہ گئی تھی۔

"مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔ پاپا نے بھی ذکر نہیں کیا۔"

"وہ جی بڑے صاحب تو اس وقت آپ سے ملنے لندن گئے تھے۔" امترا کچھ دھیمی آواز میں رازداری سے کہہ رہی تھی۔

"حسن بابا نے کیوں جاب چھوڑی ہے۔ کیا وہ سیلری سے مطمئن نہیں تھے؟"

"ایسی بات نہیں جی شہری صاحب!" امترا نے مزید لہجے میں تجسس بھرا تو شہرے کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"بتاؤ ہی دو۔"

"پہلے آپ وعدہ کرو' کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی جو کچھ میں آپ کو بتاؤں گی۔" امترا کے انداز میں کچھ تو تھا کہ شہرے کھٹک سی گئی۔

"وعدہ رہا۔"

"شہری جی! نفیسہ میڈم نے خانساماں کی چھٹی کروا دی ہے۔ وہ نفیسہ میڈم کو پسند نہیں تھے۔ ایمان دار جو تھے اور ہم ٹھہرے لالچی' اس لیے نفیسہ میڈم کے جال میں پھنس گئے۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ نفیسہ آنٹی کی جرات کیسے ہوئی ہمارے ڈومیسٹک معاملات میں ٹانگ اڑانے کی۔" شہرے نے ناگواری سے چیخ کر کہا تھا۔ وہ ایکدم پوری جان سے کانپ گئی تھی۔ نفیسہ اور امترا ان دونوں کے "تاریقیناً" جڑے ہوئے تھے اور وہ نادان ملازموں کے بارے میں اتنے سالوں سے اس عورت پر بھروسہ کرتی رہی تھی۔

"اپنے ذاتی' گھریلو معاملات میں آپ نے خود نفیسہ میڈم کو گھسنے کی اجازت دی ہے۔ آپ کے گھر کا ہر معاملہ نفیسہ میڈم کے بیڈروم میں ڈسکس ہوتا ہے۔ انہوں نے پوری پلاننگ سے آپ کو لندن پڑھنے کے لیے بھجوایا ہے تاکہ کھل کر کارڈ کھیل سکیں۔ صاحب بہت بیمار رہتے ہیں انہوں نے کبھی ارد گرد کی طرف دھیان نہیں دیا۔ ان کی دنیا صرف آپ تک محدود ہے اسی لیے نفیسہ جیسی عورتوں کو کھلی چھوٹ مل گئی ہے۔ میرا نام امترا نہیں "مریم" ہے۔ میں گریجویٹ ہوں' ان کے اسٹور پر کام کرتی ہوں۔ شاید بہت چالاک بھی ہوں اسی لیے نفیسہ کی نظر مجھ پر ٹھہر گئی تھی۔ آپ کے گھر میں بس نوکر میڈم کی مرضی سے آتے ہیں تاکہ اس گھر میں ہونے والی ہر بات سب سے پہلے ان تک پہنچے۔ بشر جمل اور میڈ ایوا دونوں ہی میڈم کے اشاروں پر ناچتے تھے۔ جب آپ نے انہیں فارغ کیا تو میڈم کو شدید دھچکا پہنچا تھا۔ مگر وہ جلد ہی سنبھل گئیں اور مجھے دریافت کر کے لے آئیں۔ میں شاید لالچ میں آپ پڑ جاتے اور بھی کیا کیا ستم ڈھاتی مگر جلد ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میں بہت غلط کام کر رہی ہوں۔

اس کا احساس مجھے یاسر نے دلایا تھا۔ وہ ایک پاکستانی ہے اور میں اس کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کر چکی ہوں۔ میرا اصل نام مریم ہے۔ جو کہ میرے بابا نے بہت شوق سے رکھا تھا۔ آپ کو یاد ہو گا شہری جی!

میں نے آپ سے ایک مرتبہ کہا تھا کہ میری خواہش ہے میں کسی پاکستانی سے شادی کروں۔ یہ خواہش پوری ہو چکی ہے۔ میں انڈیا کی نہیں یہیں کی رہنے والی ہوں۔ ممی کے پچھلوں کا تعلق بنگال سے تھا مگر وہ لوگ عرصہ دراز سے ریاض میں رہائش پذیر تھے۔ میری ممی نے پہلی شادی ایک عربی سے کی تھی۔ تین سال تک میری ماں کے ہاں جب کوئی اولاد نہیں ہوئی تو اس آدمی نے دوسری شادی کرلی اور ممی کو چھوڑ دیا۔ پھر انہوں نے دوسری شادی ایک پاکستانی سے کی تھی۔ پھر میری بڑی بہن اور میں پیدا ہوئی۔ وہ بہت عرصے سے ممی سے ناراض ہو کر لندن چلی گئی تھی۔ اور ہم لوگ ملائشیا آگئے۔ چند سال بعد پاپا کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔ میرے نزدیک پاپا سر سے ملنے سے پہلے مذہب کی کوئی اہمیت نہیں تھی مگر اس سے مل کر صحیح اندازہ ہوا ہے کہ مذہب کے بغیر انسان اپاہج ہوتا ہے۔

شہری جی! میری کوتاہیوں اور گناہوں پر مجھے معاف کر دینا۔ حالانکہ میں نے آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ مگر میں خود کو مجرم تصور کرتی ہوں میں صرف آپ کو ایک بات بتانا چاہتی ہوں کہ نفیسہ آپ کے ساتھ مخلص نہیں ہے۔

میں آج شام دوسرے شہر چلی جاؤں گی۔ صاحب اب اکیلے ہو جائیں گے۔ آپ جلد از جلد واپس آجائیں اور ایک بات میں آپ کو بہت شرمندگی کے عالم میں بتا رہی ہوں کہ میڈم مجھے اس لیے میڈ بنا کر آپ کے گھر لائی تھیں کہ میں صاحب کو اپنی طرف متوجہ کرلوں تاکہ وہ لوگ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکیں مگر صاحب نے ان کے کسی بھی ارادہ کو پایہ تکمیل تک پہنچنے نہیں دیا۔ وہ ان کی تمام تر پلاننگ کو جان گئے تھے۔ فون بہت لمبا ہو گیا ہے اور مجھے ابھی بس اسٹاپ تک جانا ہے اس لیے اللہ حافظ... مجھے معاف کر دینا شہری جی!" وہ تیز تیز بول رہی تھی اور پھر ایکدم ہی لائن منقطع کر دی گئی۔ ٹوں ٹوں کی مخصوص آواز اسے ہوش کی دنیا میں کھینچ لائی۔

"او گاڈ۔" شہرے نے سر ہاتھوں پر گرا لیا اور بے آواز رونے لگی۔

☼ ☼ ☼

وہ جتنی بھی کوشش کرتی ایگزامز سے پہلے واپس نہیں جا سکتی تھی۔ اسرا (مریم) سے کیلی فونک گفتگو سچائی پر مبنی تھی۔ وہ ان سب "فیکٹس" سے نظر نہیں چرا سکتی تھی۔ جوں ہی اس نے روم میں پہلا قدم رکھا فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

ریسیور کان سے لگایا تو دوسری طرف پاپا کی آواز سن کر وہ خوشگوار حیرت میں گھر گئی تھی۔ انہوں نے اس وقت کبھی فون نہیں کیا تھا۔

"پاپا آپ ٹھیک تو ہیں؟" اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"مجھے کیا ہونا ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں' بلکہ پہلے سے کچھ زیادہ ہینڈسم ہو گیا ہوں۔" ان کے لہجے میں چھپی شرارت محسوس کرکے وہ کھلکھلا اٹھی۔

"پاپا! میں بہت جلد آپ کے پاس آجاؤں گی۔ اور پھر ہمیشہ ہمیشہ آپ کے پاس رہوں گی۔"

"ہمیشہ ہمیشہ کیوں؟ میں تو جلد تمہاری شادی کروں گا۔ اور پھر پورے "ہوم لینڈ" پر راج کروں گا۔" انہوں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔" شہری نے انہیں دھمکایا۔

"نری خوش فہمی... آپ کا کیا خیال ہے کہ میں نے گھر داماد کے متعلق پلاننگ کر رکھی ہے۔" ان کے لہجے میں بھرپور شرارت تھی۔

"پاپا!" وہ ٹھنکی۔

"جی پاپا کی جان۔" ان کے انداز میں لہجے میں الفاظ میں محبت ہی محبت تھی۔

"آج آپ بہت موڈ میں لگ رہے ہیں۔"

"میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں اپنی بیٹی سے آج ڈھیروں باتیں کروں۔" انہوں نے خوش دلی سے کہا۔

"پاپا! آپ ٹھیک ہیں نا۔" شہری نے بھی انہیں چھیڑنا چاہا۔

"آپ کا اندازہ درست ہے۔" وہ شاید مسکرائے تھے۔

"کیا مطلب؟" شہرے نے چلا کر کہا۔

"جو آپ سمجھ لیں۔" وہ اسے خوب خوب چھیڑ رہے تھے۔

"پاپا! آپ کا کہیں دوسری شادی کا ارادہ تو نہیں؟"

"بالکل ٹھیک سمجھی ہیں آپ۔" ان کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ شہرے بھی مسکرا دی۔

"میں اپوزیشن گروپ میں شامل ہوں۔" اس نے اعلان کیا۔

"ہم حزب اختلاف کو منا لیں گے۔" وہ بھرپور یقین سے بولے تھے۔ شہرے ہنس ہنس کر دوہری ہو گئی۔

"میں فیڈرل گورنمنٹ کی باتوں میں آنے والی نہیں۔"

"گورنمنٹ کو صرف باتیں بنانا تو آتی ہیں۔ ہم آپ کو اپنی پیچ دار باتوں میں الجھا لیں گے۔" وہ ابھی بھی غیر سنجیدہ تھے اور شہرے ان کی گفتگو کے بے ساختہ پن کو انجوائے کر رہی تھی۔

"آپ اس وقت کیا کر رہے ہیں؟" تفتیش شروع ہو چکی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ شہری ان کے دیر تک جاگنے پر سخت خفا ہو گی۔ اسی لیے مزے سے بولے۔

"آپ سے باتیں۔"

"اس سے پہلے۔" شہری تھانیدارنی بن چکی تھی۔ وہ بے ساختہ مسکرائے۔

"ٹی وی دیکھ رہا تھا۔"

"پاپا! ذرا ٹائم دیکھیں "نیند" آپ کی صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔" اس نے خفگی سے کہا تو وہ قدرے بدلے بدلے لہجے میں بولے۔

"سونا ہی تو ہے... اب کچھ دیر جاگ کر تمہاری آواز سن کر دل کو خوش کرنا چاہ رہا ہوں۔"

"پاپا! میں آپ کو بہت مس کر رہی ہوں۔" اس نے رنجیدگی سے کہا۔

"تیاری کیسی ہے؟ رزلٹ حسب معمول شاندار ہونا چاہیے۔" انہوں نے اس کا دھیان بٹانا چاہا تھا۔ جس میں کامیابی ہوئی تھی۔

"فرسٹ کلاس۔ یوں لگتا ہے پورا سلیبس میں نے گھول کر پی لیا ہے۔" شہری ہنستے ہوئے بتا رہی تھی۔

"پیپرز کا بوجھ اتار کر بھاگنے کی نہ کرنا بلکہ خوب گھوم پھر کر انجوائے کرنا۔ گرین وچ کی جھیل دیکھنے ضرور جانا۔ ایک بات بتاؤں شہری! میں اور تمہاری ممی ہنی مون منانے لندن گئے تھے۔ گرین وچ کی جھیل تمہاری ممی کو بہت پسند تھی۔ وہیں ایک درخت کے موٹے تنے پر تمہاری ممی نے میرا اور اپنا نام لکھنے کی کوشش کی تھی۔ باسمہ کو بھی تمہاری طرح سیاحت کا جنون تھا۔ اسے بھی اولڈیسٹ (قدیم ترین) چیزیں اٹریکٹ کرتی تھیں۔ چاہے وہ کوئی عمارت ہو' اسپتال ہو' بچوں کی نرسری ہو یا پھر قیمتی پتھر۔ وہ ضد کرکے آرڈر سیٹر ہائی لینڈ میں واقع "فورٹ جارج" کے قلعے کو دیکھنے گئی تھی۔ اور پھر رولڈ ہیم جنرل اسپتال کی تو اس نے اتنی تصویریں بنائی تھیں کہ وہ البمز میں تمام تصویریں لگی تھیں۔" پاپا ماضی کی خوشگوار یادوں کو تازہ کر رہے تھے۔ وہ بھی خواب کی کیفیت میں سن رہی تھی۔

"لندن میں ہم اسفند کے گھر ٹھہرے تھے۔ ان دنوں وہ اپنے بیٹوں ہارون اور فرزان کے ساتھ لندن میں ہی رہائش پذیر تھا۔ اسفند کی مسز ہاجرہ بھی بہت اچھی تھیں۔ اسفند کے چھوٹے بیٹے زارون کو باسمہ نے اپنا بیٹا بنانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔"

"پاپا! میں ضرور پاکستان جاؤں گی اور اپنی ممی کے اتنے اچھے بھائی سے ضرور ملوں گی۔ مجھے تو اتنے اچھے ماموں جان سے بے تحاشا محبت ہو گئی ہے۔ میں ان سے ضرور ملوں گی۔" اس نے بہت جوش کے عالم میں کہا تھا۔

"تم وہاں ضرور جانا۔ وہ لوگ باسمہ کی اولاد سے منہ نہیں موڑیں گے۔" وہ دھیمی آواز میں بولے تھے۔

"پاپا! کیا نانا اور نانو ممی سے شادی کے بعد بھی خفا تھے۔ یہ شادی ان کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی نا۔" یہ سوال تو اسے اکثر پریشان کرتا تھا۔ وہ اپنی الجھن دور کرنا چاہتی تھی۔

"وہ صرف باسمہ سے ہی نہیں اسفند سے بھی بہت عرصہ تک ناراض رہے تھے۔ اسفند سے ان کی صلح باسمہ کی ڈیتھ پر ہوئی تھی۔ باسمہ کے پاپا اسفند کو موردالزام ٹھہراتے تھے کہ وہ ہی تو ہمیں ایک کرنے کا سبب بنا تھا۔ تمہارے دوسرے چار ماموں بہت عرصہ تک اسفند سے خفا رہے تھے۔" پاپا کی آواز میں نمی گھلنے لگی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ممی کا ذکر ان کی "یاد" پاپا کی آنکھوں میں آنسو بھر دیتی ہے۔ فون رکھنے سے پہلے وہ اسے دودھ پینے کی تاکید کرنے لگے تھے۔ اور شہری بھی انہیں کچھ اسی قسم کی ہدایات دے رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

پیپرز کا بوجھ کیا اترا تھا۔ وہ ایکدم ہلکی پھلکی سی ہو گئی تھی۔ انجلی دوران امتحان غیر حاضر تھی۔ جس دن اس نے آخری پیپر دیا تھا اسی شام وہ واپس آئی تھی۔ شہرے بے حد حیران ہوئی۔

"کہاں تھیں تم؟"

"میں شہر سے باہر گئی تھی۔" انجلی نے لاپروائی سے سر جھٹک کر جواب دیا تھا۔ اور پھر اس کی حیران آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

"میں نے کولڈی سے شادی کر لی ہے۔"

"اوہو۔" شہری نے گہرا سانس خارج کیا۔ اسے انجلی سے کسی ایسے اقدام کی توقع پہلے سے ہی تھی۔

"کیا اس نے تمہارا مذہب قبول کر لیا ہے؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" انجلی پاؤں جھلاتے ہوئے بولی۔

"تم ہندو ہو اور تمہارا شوہر عیسائی۔ تمہارے بچے کیا ہوں گے۔" اس نے طنزیہ کہا تھا۔

"ان کا بھی کچھ مکسچر بن ہی جائے گا۔" انجلی قہقہہ لگا کر ہنس رہی تھی۔

"دفع دور۔" اسے ایک دم کراہت آنے لگی تھی۔ انجلی اس کے تاثرات سے مزا لیتی ہوئی واش روم میں گھس گئی۔

اگلی صبح وہ جینز شرٹ پہنے کہیں جانے کے لیے تیار تھی۔

"اب تو ایگزامز بھی ہو چکے۔ اپنے حجرے سے نکل آیئے مادام۔ باہر کا موسم بہت اچھا ہے۔ آؤ گولف کلب چلتے ہیں۔" وہ شہرے کو اپنے ساتھ چلنے کی آفر کر رہی تھی۔ کچھ سوچ کر وہ بھی اس کے ساتھ چلی آئی۔

"مجھے تو گولف کھیلنا نہیں آتا۔" انجلی کے اصرار پر وہ بے ساختہ بدک کر بولی تھی۔

"اس میں مشکل ہی کیا ہے۔"

"مجھ سے ٹھیک طرح سے ہٹ نہیں لگائی جاتی۔" اس نے بے بسی سے کہا تو انجلی ہنسنے لگی۔

"یہ سب لوگ کہاں کے پلیئر ہیں۔ ادھر آؤ میں تمہیں سمجھاتی ہوں۔ یہ گولف کا ہموار میدان ہے۔ اس کے نقطہ آغاز سے ایک سو دس سے چھ سو پچاس گز تک کے فاصلے میں اٹھارہ سوراخ ہوتے ہیں۔ اس کا میدان میرے خیال کے مطابق چھ ہزار گز تک وسیع ہوتا ہے۔ یہ جاپانیوں کا فیورٹ کھیل ہے۔ یوں کھڑے ہو کر پہلا ہٹ لگاؤ۔ چلو بھئی گھبراؤ نہیں۔" اس نے شہرے کا شانہ تھپتھپایا تو وہ آگے بڑھ گئی تھی۔

"ویری بیڈ۔" انجلی نے منہ بنا کر نفی میں سر ہلایا اور اس کی کارکردگی دیکھتے ہوئے افسوس کا اظہار کرنے لگی۔

"دفع کرو یہ تم نہیں کر سکو گی۔ ڈیڑھ اونس کی گیند تک کو ہٹ نہیں لگا سکتیں۔" شہرے کو ڈھیروں شرمندگی نے گھیر لیا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ مجھے نہیں کھیلنا آتا۔" وہ اردگرد کے لوگوں کو مختلف کمنٹس پاس کرتے اور ہنستے دیکھ کر خفت سے بولی تھی۔ انجلی خود بیگ اور گیند اٹھاتے ہوئے ہنس رہی تھی۔

دوسری سہ پہر انجلی اسے منانے کی غرض سے پیزا

پیک کروا کر لے آئی تھی۔ آج کل وہ ویسے بھی بہت مصروف تھی۔ اس نے بی این میں جاب کر لی تھی۔ ان دنوں ایک مقامی چینل سے بزنس نیوز کے متعلق نئی نئی اطلاعات عوام تک پہنچا رہی تھی۔ شہرے خود بہت مصروف تھی۔ واپس جانے کی تیاریوں میں دن گزرنے کا پتا ہی نہیں چل رہا تھا۔

وہ آنٹی اور رحمہ پر کچھ بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسی لیے ان کے لیے بھی اس نے کافی کچھ خرید لیا تھا۔ کل شام آٹھ بجے اس کی فلائٹ کا ٹائم تھا اور آج وہ اپنی درسگاہ کو آخری مرتبہ دیکھنے کے لیے چلی گئی تھی۔ وہ اپنے ڈپارٹمنٹ، لائبریری اور کلاس روم سے ہوتی ہوئی گراؤنڈ میں چلی آئی تھی۔ چھ سالوں کا ساتھ اب ٹوٹنے والا تھا۔ شہرے جانتی تھی کہ آج کے بعد وہ کبھی بھی لندن کی فضاؤں کو محسوس نہ کر سکے گی۔ کیونکہ اب اسے یہاں واپس نہیں آنا تھا۔

اسے پتا بھی نہ چلا تھا کہ کچھ آنسو اس کے گال بھگونے لگے تھے۔ وہ گراؤنڈ کی نرم گھاس پر بیٹھ گئی۔ یوں ہی ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بالکل اچانک غیر متوقع اس نے ایک ایسے چہرے کو دیکھ لیا تھا جو کہ اس کے لاشعور میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو چکا تھا۔ اس نے کبھی خوابوں میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ کبھی اس چہرے کو دیکھ سکے گی۔ وہ ایک ٹک بالکل پاگلوں، دیوانوں بلکہ کسی صدیوں کے پیاسے کی مانند اسے دیکھ رہی تھی جسے ایک دم صحرا میں تالاب نظر آ گیا تھا۔ اور وہ بھاگم بھاگ پانی کی طرف لپکا تھا۔

شہرے حسنین بھی کسی پیاسے کی طرح اس کی طرف بھاگی تھی مگر وہ پل جھپکنے کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا اور زن سے اسے لے اڑا۔ وہ ابھی بکھری سانسیں ہموار کرتی وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ گئی تھی۔

"یہ اسفند ماموں کا چہرہ تھا مگر۔۔۔" وہ بڑبڑائی۔ اور پھر تھکے تھکے قدم اٹھانے لگی تھی۔ اپنے روم میں جا کر اس نے بیگ میں سے ایک تصویر نکالی اور پھر پہروں اسے دیکھتے رہی۔ دوسری مرتبہ شہرے نے اسے اسی مارٹ میں دیکھا تھا اور اس پر پھر سے دیوانگی

طاری ہو گئی تھی۔ وہ لفٹ کے ذریعے ٹاپ پر پہنچی اور پھر تقریباً بھاگتے ہوئے پارکنگ تک گئی مگر ایک مرتبہ پھر وہ اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اس کے نقوش اسفند ماموں جیسے تھے اگر بہت سال پہلے دیکھا جاتا تو وہ اسفند ماموں کی تصویر میں بالکل فٹ ہو جاتا تھا۔

عجیب بات تو یہ تھی کہ شہرے حسنین کے دل کی چوکھٹ پر کوئی قدم جما کر پوری شان سے کھڑا ہو گیا تھا۔ ایک ایسا اجنبی جسے وہ جانتی تک نہ تھی اور جس کے چہرے کے نقوش اور کھڑی ناک بالکل اسفند ماموں جیسی تھی مگر وہ اسفندیار نہیں تھا۔ وہ باسمہ حسنین کا اسفندیار نہیں تھا اور اسے صرف سات ماہ بیس دن بیالیس گھنٹوں پینتیس منٹوں اور صرف بارہ سیکنڈ کے بعد پتا چلا تھا کہ لندن کی سرزمین پر اپنی ایک جھلک دکھانے والا وہ اجنبی شہرے حسنین کا زارون اسفندیار تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ لندن سے اک نا ختم ہونے والی سرور بخش اذیت اور میٹھا میٹھا درد لے کر ملائشیا کے چمکتے دمکتے شہر صباح میں پہنچی تھی۔

مگر یہاں پہنچتے ہی اسے ایک دل دہلا دینے والی خبر ملی تھی۔ پاپا کو دوسرا ہارٹ اٹیک ہوا تھا مگر کسی نے اسے بتایا تک نہیں۔

وہ بھاگم بھاگ اسپتال پہنچی تھی۔ روم نمبر ون تھرٹی ریسپشن سے معلوم کر کے وہ دوڑتی ہوئی سیکنڈ فلور تک گئی تھی اور پھر دوسرے ہی پل وہ پاپا کے سینے سے لگی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

"پاپا! آپ کو کیا ہوا ہے؟ آپ اتنے بیمار تھے اور مجھے بتایا بھی نہیں۔ پاپا! اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو میں مر جاتی۔" وہ ان کے ہاتھ چوم رہی تھی۔ بے تحاشا رو رہی تھی اور نفیسہ اس کی اچانک آمد پر پہلو پر پہلو بدل رہی تھیں۔ رحمہ کو بھی اس کے آنے کی اطلاع مل چکی تھی اور دوسرے ہی پل وہ بھی اسپتال پہنچ گئی۔

"کیسی ہو شہری؟ اتنے سالوں بعد دیکھ رہی ہوں پہلے سے بھی زیادہ چارمنگ ہو گئی ہو۔" رحمہ خواہ مخواہ ہی گلے کا ہار بن رہی تھی۔

"مجھے کیسا ہونا چاہیے؟" اس نے سرد اور کٹیلے لہجے میں ٹھہرے ٹھہرے انداز میں کاٹتی نگاہ سے رحمہ کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"میں سمجھی نہیں۔" رحمہ قدرے بوکھلا سی گئی۔

"میں سمجھا دیتی ہوں۔" وہ زہر خند ہوئی۔ اس وقت وہ دونوں کوریڈور میں آمنے سامنے کھڑی تھیں۔ رحمہ نے نگاہ چرالی۔

"جس کا باپ بستر مرگ پر بے حس و حرکت پڑا ہو۔ اس کے حال کو پوچھ رہی ہو یا پتھر مار رہی ہو رحمہ! میرا اپنے باپ کے علاوہ کوئی خون کا رشتہ اس دنیا میں موجود نہیں ہے اور تم لوگوں نے مجھے ایک فون تک کرنا گوارا نہیں کیا۔ اگر میرے پاپا کو کچھ ہو جاتا تو میں تم میں سے کسی کو بھی معاف نہیں کرتی۔"

"تم ہمیں یوں دیکھ رہی ہو گویا ہم نے کوئی جرم کیا ہے۔" نفیسہ بھی جلتی بھنتی آگئی تھیں۔

"تو کیا نہیں کیا؟" اس کا لہجہ زہر زہر تھا۔

"بولو کیا کر دیا ہے ہم نے؟" نفیسہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ وہ آنکھیں نچاتے ہوئے بولی تھیں۔

"میرے باپ کو بستر مرگ تک پہنچا دیا ہے۔ میری فیکٹری پر قبضہ کر لیا ہے۔ میرے گھر کو بیچنے کی پلاننگ کی جا رہی ہے مگر میں تمہاری بساط تم ہی پر الٹ دوں گی نفیسہ بیگم!" شہرے کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔

"ہاں ہاں اب یہی الزام ہمارے سر آنا تھا۔ تمہارے پیچھے حسنین بھائی کا اتنا خیال رکھا۔ نیندیں قربان کیں۔ پیسہ پانی کی طرح بہایا۔" وہ ایکدم چیخنے لگی تھیں۔

"بکواس بند کرو۔" شہرے ان سے بھی زیادہ بلند آواز میں چلائی۔

"میں تم لوگوں کے تمام ترڈرامے کو جان گئی ہوں۔ تم ایک خون چوسنے والی "ڈائن" ہو۔ تم نے دیمک کی طرح ہمیں چاٹ لیا ہے مگر اب میں تم لوگوں کو مزید کوئی کھیل کھیلنے نہیں دوں گی۔ اور کس پیسے کی بات کر رہی ہو۔ میرے پاپا کی مہربانیوں سے آج تم لوگ کوالالمپور میں تین اسٹور اسٹیبلش کر چکے ہو۔ وہ اسٹور تم لوگوں کے یہاں ہیں اور اب فیکٹری بھی ہتھیانے کے چکر میں ہو مگر میں ایسا نہیں کرنے دوں گی۔" نفیسہ کو لگا تھا ان کا حلق ایکدم سوکھ گیا ہے۔ آواز گم ہو گئی تھی اور لفظ بھی کھو کھلے لگ رہے تھے۔ انہیں اپنا آپ بہت چھوٹا اور بونا سا لگنے لگا تھا۔ وہ انہیں بتا رہی تھی کہ وہ لوگ کیا تھے۔ اس کے باپ نے انہیں کیا سے کیا بنا دیا تھا۔

"میں ابھی پولیس کو انفارم کرتی ہوں۔ بہت لوگوں کی زندگیاں جہنم بنائی ہیں۔ لاک اپ کی دنیا بھی دیکھ لینی چاہیے۔" وہ پھنکار رہی تھی۔ نفیسہ کے قدموں تلے سے زمین کھسک گئی۔

"تم ایسا نہیں کر سکتیں؟"

"میں بہت کچھ کروں گی تم دیکھتی رہ جاؤ گی۔۔۔ فراڈ کا کیس ہے تم لوگوں پر، اپنی خیر مناؤ نفیسہ بیگم!" اس نے شہرے سر جھٹکا اور تیز قدموں سے سیڑھیاں اتر گئی۔

عاجف انکل تک اس کے خطرناک ارادوں کی بھنک پہنچ چکی تھی۔ فیکٹری سے دستبردار ہونا آسان تو نہیں تھا مگر اب جان کے لالے پڑ چکے تھے۔ انہوں نے کوڑیوں کے بھاؤ اسٹور اور مکان بیچا اور دوسرے ہی دن کوالالمپور چلے گئے تھے۔

شہرے نے سنا تو ایک افسردہ سی سانس خارج کی۔ اس نے تو صرف انہیں دھمکایا تھا۔ ابھی کسی انتہائی اقدام کے بارے میں سوچا ہی تھا مگر اس کی دھمکی کام دکھا گئی تھی۔ اسے ایک بات تو سمجھ میں آچکی تھی کہ لوگوں نے اپنے بھیانک چہروں پر کیسے کیسے نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔

اندر سے کیسے کریہہ اور غلیظ تھے اور باطن اس قدر پالش شدہ۔ اسے آنٹی کی تمام باتیں یاد آرہی تھیں۔ اس پر جی بھر کے پیار لٹانا، خیال رکھنا، کیسا شہد آگیں لہجہ تھا ان کا۔ اور وہ رحمہ جسے پاپا نے بیٹی بنا رکھا تھا۔ وہ جو اس کی ہر چیز پر قبضہ جماتی تھی۔ اور جس کے تمام شوق پاپا بخوشی پورے کرتے تھے۔ کیسے دھوکے باز لوگ تھے۔

پاپا کی بیماری اور عاجف انکل کے فراڈ نے اسے اندر سے توڑ دیا تھا مگر وہ پھر بھی خود کو مضبوط ظاہر کر رہی تھی۔ پاپا کو ایک ماہ بعد ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ اور شہرے پورا وقت ان کے ارد گرد گھومتی رہتی۔ جب پاپا اونگھنے لگتے تو وہ کچھ دیر کے لیے فیکٹری چلی جاتی تھی۔

اسی طرح دن روکھے پھیکے سے گزر رہے تھے۔ ان پھیکے دنوں میں ہلچل انجلی کی آمد سے ہوئی تھی اور دوسری خوشگوار خبر اس کے ایم بی اے میں ٹاپ کرنے کی تھی۔ وہ بے انتہا خوش تھی۔ پاپا بھی بہت مسرور تھے۔

انجلی اس کے پاس رہنے کے لیے آئی تھی۔ وہ پہلے سے بہت کمزور دکھائی دے رہی تھی۔ شہرے نے پوچھا تو سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ اس میں ایک یہی عادت تو اچھی تھی کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی تھی۔

"تو کیری نے تمہیں کیوں چھوڑا؟ اور ابھی شادی کو عرصہ ہی کتنا ہوا ہے۔ آخر وجہ کیا تھی؟"

"کیا کرو گی سن کر۔۔۔ مختصر یہ کہ میرے اور اس کے ستارے نہیں ملتے تھے اور بہت سے لوگوں کی طرح ہماری شادی بھی ناکام ہو گئی ہے۔" وہ ہمیشہ کی طرح ہر بات چٹکیوں میں اڑا رہی تھی۔

"اب تم کیا کرو گی؟" شہرے نے گہرے دکھ سے کہا۔

"کرنا کیا ہے۔ یہیں رہنے کا ارادہ ہے۔" انجلی ہنس رہی تھی۔

"تم ہو ہی ایسی کہ پوز کرتی ہو۔" شہرے نے الجھ کر پوچھا۔

"بہت انوسینٹ ہو تم شہری! جو تمہارا "وہ" ہوگا نا دیکھنا دنیا کا سب سے خوش قسمت مرد ہوگا۔" وہ اسے بڑے کھلے دل سے سراہ رہی تھی۔

"یہاں رہ کر کیا کرو گی انجلی؟" اس نے بہت دیر سوچنے کے بعد کہا۔

"جاب۔ اور اس کے بعد ایک اور شادی۔" انجلی نے کھلکھلا کر بتایا تھا۔ شہرے کی آنکھوں میں حیرت سی بھر گئی۔

"ایک اور شادی، کیا یہ آسان ہے۔"

"تو اس میں مشکل ہی کیا ہے۔ شادی تو مجھے کرنا ہی ہے مگر اب میں اپنے ہم مذہب اور ہم وطن سے کروں گی۔ اب کوئی خسارہ میں برداشت نہیں کر سکتی۔" اب کے انجلی کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

"اگر جاب کرنا ہے تو میری فیکٹری میں کر لو۔"

"آفر اچھی ہے۔ سوچوں گی۔" انجلی سپاٹ لہجے میں بولی تھی۔

"سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے اس وقت ایک دوست اور ہمدرد کی ضرورت ہے۔ انجلی! تم اس کرائسس میں میرا ساتھ دو گی۔ میں اس بھری دنیا میں صرف تم پر بھروسہ کر رہی ہوں۔ تم بھی نفیسہ آنٹی کی طرح مجھے دھوکا مت دینا اب مجھ میں مزید ٹوٹنے کی سکت نہیں ہے۔" شہرے ایکدم اس کے شانے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ سچ تو یہ تھا پاپا کی بیماری، اپنے اکیلے پن اور اس زہریلی تنہائی نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ان لاکھوں انسانوں کی بھیڑ میں انجلی کا جانا پہچانا چہرہ دیکھ کر وہ کھل اٹھی تھی۔ اب دل کو قدرے ڈھارس ہوئی تھی۔

انجلی خود بھی اسے یوں بکھرتا دیکھ کر رونے لگی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ گویا دل پگھل کر بہنے لگا ہے۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں شہرے! مجھے بھی ایک سہارے کی ضرورت ہے۔ میں خود کو جھوٹے بہلاوں سے بہلا بہلا کر تھک چکی ہوں۔ میرا بھی اس دنیا میں کوئی نہیں۔ میں نے بھی زندگی بھر خوشی اور سکون کا ذائقہ نہیں چکھا۔ نہ میرا کوئی گھر ہے نہ ماں نہ باپ۔ میں خود کو زمین پر بوجھ سمجھنے لگی تھی۔ ایکدم میرا ہر شے سے جی اچاٹ ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ میں نے خودکشی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ میں

تمہارے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتی ہوں۔ میں انجلی نہیں ایما ہوں۔" وہ شرمندگی سے سر جھکائے بول رہی تھی جبکہ شہرے حیران پریشان سی اسے دیکھنے لگی۔ اس انکشاف نے اسے دم بخود کر دیا تھا۔

"ہم دو بہنیں ہیں۔ مریم میری چھوٹی بہن ہے، جو کہ پہلے امترا کے نام سے جانی پہچانی جاتی تھی۔ ہماری ماں ہندو عورت تھی۔ اس نے پہلی شادی بھی ایک مسلمان سے کی تھی اور دوسری بھی۔

پاپا نے میرا نام ایما اور امترا کا مریم رکھا تھا۔ مجھے یاد ہے انہوں نے ہمیں کلمے بھی یاد کروائے تھے اور نماز بھی۔ مگر ممی کو یہ سب اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ خود کو پاپا سے شادی کے بعد بھی ہندو سمجھتی تھیں۔ پاپا کے مرنے کے بعد میں انجلی اور مریم "امترا" ہو گئی۔ مگر ہم دونوں کو ہی مذہب سے دلچسپی نہیں تھی۔ مختصر یہ کہ میں نے یورپ جانے کے جنون میں گولڈی سے دوستی کر لی اور پھر ملائشیا چھوڑ کر لندن چلی گئی۔ ایک بات بتاؤں شہرے! مجھے انجلی بننا راس نہیں آیا اسی لیے اب پھر سے ایما بننے کی کوشش کر رہی ہوں.... اس کوشش میں تم میرا ساتھ دو گی نا۔" اس نے آس بھری نگاہوں سے شہرے کو دیکھا تو وہ بے اختیار اثبات میں سر ہلانے لگی۔

"تم اپنی بہن مریم سے ملی ہو؟"

"ہوں، ملائشیا آنے کے فوراً" بعد میں نے اس سے رابطہ کیا تھا۔ وہ اپنے گھر میں بہت خوش ہے۔ اس کی ایک پیاری سی بیٹی بھی ہے۔" ایما کچھ خوشی اور جوش کے عالم میں اپنے ہینڈ بیگ میں سے تصویریں نکالنے لگی۔

"یہ دیکھو، میری بہن مریم اس کی بیٹی عائشہ اور یاسر.... وہ بہت خوش ہے اپنے گھر میں۔ مریم نے بالآخر اپنا گھر بنا لیا ہے۔ انسان جس کی دل سے طلب کرتا ہے، اسے ضرور حاصل کر لیتا ہے۔ بس سچی لگن کا ہونا ضروری ہے۔"

"ارے یہ مریم ہے؟" شہرے نے تصویر کو بغور دیکھا اور خوشی سے چہکی۔

"تم مریم کو جانتی ہو؟"

"ہاں، بس تھوڑا بہت...." اس نے جان بوجھ کر مریم کا حوالہ "میڈ" کے طور پر ایما کو نہیں بتایا تھا۔

"جب تک پاپا مکمل صحت یاب نہیں ہو جاتے تمہیں فیکٹری کی دیکھ بھال کرنا ہو گی میں پاپا کو اک پل کے لیے بھی تنہا نہیں چھوڑنا چاہتی۔" شہرے اسے مختصر ترین فیکٹری کے متعلق معلومات دے رہی تھی۔

"ایک بات ہے شہرے! تمہیں میری سیلف ریسپکٹ کا خیال رکھنا ہو گا۔" ایما نے مسکرا کر کہا تھا۔ شہرے بھی نرمی سے مسکرا دی۔

"تم مجھے اپنے حق میں مخلص پاؤ گی۔" شہرے نے یقین دہانی کروائی تھی۔ ایما نے آنسو پونچھے اور بولی۔

"اور مجھے بھی.... میرے اخلاص کو وقت ثابت کرے گا۔ تم نے مجھے مان اور یقین دیا ہے۔ میں تمہارے بھروسے کو کبھی توڑنے کی کوشش نہیں کروں گی۔" اس کی آنکھوں سے سچائی روشنی بن کر پھوٹ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم نے میرے پاپا پر قبضہ کر لیا ہے ایما!" شہرے مصنوعی خفگی سے کہہ رہی تھی۔ ڈرائی فروٹ کھاتی ایما مسکرانے لگی تھی اور پھر اسے چڑانے کی غرض سے بولی۔

"تم نے اچھے پاپا کی ڈھیر ساری محبت اکیلے اکیلے بٹور چکی ہو۔ اب ہمارا بھی کچھ حق بنتا ہے۔ کیوں پاپا! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔" ایما نے لاڈ سے ان کے شانے پر دونوں ہاتھ رکھے تھے اور پھر اسے ٹھینگا دکھانے لگی۔

"پاپا! آپ یہ فائلیں چیک کر لیں...." شہرے کے اٹھتے ہی ایما نے تمام فائلیں ان کے سامنے کھولیں تو وہ ناراضی سے کہنے لگے۔

"یہ اب تم دونوں کا کام ہے۔ میں ریٹائر ہو چکا ہوں۔" انہوں نے صاف جھنڈی دکھا دی تھی۔ ایما فائلیں سمیٹ کر اسے ڈھونڈتی ہوئی کچن میں آ گئی۔

شہرے برتن صاف کر رہی تھی۔ ایما بھی دوسرے سنک کی ٹونٹی کھول کر اس کا ساتھ دینے لگی۔ آج مریم ڈنر پر آئی تھی۔ کچھ نئے حوالے اور پرانی یادوں کی وجہ سے وہ بہت جھجک رہی تھی۔ بے حد شرمسار تھی۔ شہرے نے اس کی تمام جھجک کو چٹکیوں میں اڑا دیا۔ وہ مریم کو ایما کے حوالے سے خاص اہمیت دے رہی تھی۔ پاپا بھی یہ جان کر کہ مریم، ایما کی بہن ہے، بہت خوش ہوئے تھے۔ مریم کا ہزبینڈ یاسر نہیں آیا تھا۔ شہرے نے پوچھا تو نہ جانے کیوں مریم خاموش ہو گئی تھی۔ وہ پاپا سے ڈھیروں دعائیں لے کر رخصت ہوئی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"بس ایسے ہی۔" اس نے سر جھٹک کر کہا۔

"ہمیں بتانے کی ضرورت نہیں بنو! سب جانتے ہیں ہم۔ اپنے خوابوں کے شہزادے کو سوچ رہی ہو نا۔" ایما نے یقین بھرے لہجے میں کہا تھا۔ وہ قدرے رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ میں خوابوں میں رہنے والی لڑکی نہیں ہوں۔ اور پھر زندگی نے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ کچھ خوابوں کو آنکھوں میں سجا لیا جائے۔" اس کا لہجہ لڑکھڑا رہا تھا۔ نہ نہ کرنے کے باوجود دل کے دریچے میں کوئی ہولے سے جھانک رہا تھا۔ کسی نے بہت چپکے سے دل کی نرم زمین پر پہلا قدم رکھ دیا تھا۔ اس کے چہرے پر کچھ قوس و قزح کے رنگ پھیل گئے تھے۔ آنکھیں کچھ دھنک اور خوابوں کے بار سے بوجھل ہو گئی تھیں۔ ایما بہت چاہ کے عالم میں اس کے چہرے پر بکھری، کچھ کہتی بولتی چاہت کو دیکھ رہی تھی۔

"مان جاؤ شہری! کہ تم نے خوابوں کے جزیرے میں پہلا قدم رکھ دیا ہے۔" ایما نے اسے ڈھیر ساری گدگدی کی۔

اور اس رات شہرے نے اپنے ہر راز میں ایما کو شریک کر لیا تھا۔ وہ اپنے دل کی بدلتی کیفیت اور لندن کی اس شام کا ذکر کر رہی تھی جب بام کے درختوں سے جھانکتی بدلیوں نے بڑی شریر سی چھیڑ چھاڑ کی تھی۔

بائیں پہلو میں کچھ نئے پن کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے محبت کے میٹھے درد کو پوری شدت سے محسوس کر لیا تھا۔ شہرے حسنین کو اس اجنبی سے محبت ہو گئی تھی۔

آج "چودھویں" کی رات تھی۔ تبھی تو ہر شے نور میں نہائی لگ رہی تھی۔ چنبلی اور جوہی کے پھول مسکرا رہے تھے۔ فضا خوشبوؤں اور پھولوں کی مہک سے بوجھل تھی۔ گل انار پر بھی جوانی اتر آئی تھی۔ خوابیدہ کلیاں بھی انگڑائیاں لے رہی تھیں۔ ہوا نزاکت کی چال میں بڑی مغرور سی چل رہی تھی۔ کالی گھٹا نے شرما کر منہ چھپا لیا۔ خیابان اور پھلواری کی ترنگ ہی نرالی تھی۔ باد صبا اور باد نسیم خوشبو کے ہار لیے کلیوں کے رخسار چوم رہی تھی۔ کلیاں چٹک رہی تھیں، خوشبو بکھر رہی تھی۔ ارغوانی ٹہنیاں بھی مست ہوا کا ساتھ دے رہی تھیں۔ یہ اطیب ہوا تھی۔ بڑی پاک، صاف شفاف، خوشبودار۔ اس اطبالہ کی ڈبیا میں محبت کی مہک بند تھی اور سینے میں دھڑک رہی تھی۔ سات رنگوں کا ریشم الجھ رہا تھا، کچھ سلجھ رہا تھا۔

نوک مژگان پر پہلی شبنم نے اتر کر چاہت کے قدم چومے تھے۔ محبت کی آواز پر دل نے لبیک کہا تھا۔ سفید پھولوں کے باغ لہک لہک کر تائید کر رہے تھے۔ عصفر کے پھول بھی جھومنے لگے۔ صباحت کے شہر میں کبھی ایسی رات آج سے پہلے نہیں اتری تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں سوچا کرتی تھی کہ یہ بچہ میرے گناہوں کی سزا بن کر آ رہا ہے مگر اب ممتا کے سوتے نہ جانے کہاں سے پھوٹ پڑے ہیں۔" ایما نے ننھے ایمان کو چوم کر اس کی گود میں دے دیا تھا۔

مریم بھی رات سے ادھر ہی تھی۔ وہ لوگ بہت خوشی خوشی ننھے ایمان کو لے کر اسپتال سے گھر آئے تھے جب حسن پاپا نے گھبراتے ہوئے اطلاع دی۔

"شہری بی بی! صاحب کی طبیعت بہت خراب ہے۔"

"کہاں ہیں پاپا؟" وہ بھاگتے ہوئے ان کے بیڈروم میں آئی تھی۔ وہ صوفے پر بالکل چت لیٹے تھے۔ شہری نے روتے ہوئے انہیں بری طرح جھنجھوڑا۔

"مگر نجانے کیوں آج انہوں نے شہری کی آنسوؤں سے گھبرا کر آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔

"نہیں پاپا! آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔" وہ بے یقینی کے عالم میں مریم سے لپٹی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ ایما نے گھبراتے ہوئے ڈاکٹر کو فون کیا تھا۔ ڈاکٹر چند منٹوں میں ہی آگیا۔ وہ ان کا چیک اپ کر رہا تھا۔ نبض ٹٹولی' دل کی دھڑکن چیک کی اور پھر تاسف سے سر ہلاتا کھڑا ہو گیا۔

"آئم سوری۔" اس کے دو لفظ شہرے کی دنیا اجاڑ گئے .... وہ ایکدم لہرا کر مریم کی بانہوں میں جھول گئی تھی۔

ہوش تو اسے چند گھنٹوں بعد آگیا تھا مگر اس کی حالت کے پیش نظر ڈاکٹر نے اسے سکون کا انجکشن لگا دیا .... وہ دو دن سوئی جاگی کیفیت میں دیواروں کو تکتی رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ دھیرے دھیرے اس کا شعور نیند سے جاگنے لگا۔ وہ اپنے نقصان کا اندازہ لگانے کے قابل ہو گئی تھی۔ اسی لیے ایک دفعہ پھر گھر کے درودیوار اس کی آہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے رو پڑے۔

سیکنڈ منٹوں میں اور منٹ گھنٹوں میں بدلنے لگے۔ رات دن میں اور دن رات میں ادغام کر رہا تھا۔ وقت کی نبض کبھی رکی نہیں تھی۔ اسے تو صرف چلنا ہی تھا۔ مریم اور ایما کی محبتوں اور دلجوئی نے رستے زخموں پر مرہم رکھا تھا۔ کبھی کبھی شہرے سوچتی تھی کہ اگر ایما اور مریم نہ ہوتیں تو وہ تنہا ان دیواروں سے ٹکریں مارتے مارتے خود ہی مرجاتی اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔

مریم بھی اپنا گھر بار چھوڑ کر صرف اس کی تنہائی کی خاطر ادھر رہ رہی تھی اور جب وہ اپنے مخصوص ہندی لہجے میں "شہری جی" کہتی تو اسے بہت اچھا لگتا۔ مریم اس سے بڑی تھی مگر اس کا بہت احترام کرتی تھی۔

اس شام مریم اسے ہمیشہ کی طرح گم سم بیٹھا دیکھ کر لان میں چلی آئی تھی۔ کافی دیر خاموش رہنے کے بعد مریم نے اسے مخاطب کیا۔

"ہر جان نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے"۔ مریم نے ایک قرآنی آیت کا ترجمہ کیا تو شہرے چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"آپ کا ایمان اس آیت کے بارے میں کیا کہتا ہے؟" مریم نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ کچھ نہیں بولی تھی۔ بس سر جھکائے آنسو پیتی گھاس کو نوچتی رہی۔

"شہری جی! میں آپ سے کچھ پوچھ رہی ہوں؟" اب کے مریم نے کچھ سختی سے کہا۔ وہ خاموش رہی تھی اور سر کو گھٹنوں میں چھپانے لگی تھی۔

"القرآن کتاب پاک پیغمبر پر اتری ہے۔ اس کا لفظ لفظ سچا ہے۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"تو پھر آنسو پونچھ ڈالیے شہری جی! کہ یہی اللہ کا حکم ہے۔ اس نے ایک مقرر وقت تک مہلت دے رکھی ہے انسان کو۔ اللہ جب چاہے اپنے بندوں میں سے جس کو مرضی اپنے پاس بلالے۔ یہی ہمارا ایمان ہے عقیدہ ہے۔ ہم صرف اچھی بندگی کے لیے بھیجے گئے ہیں تاکہ اس کی عطا کی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کریں۔ مگر ہم ایسا نہیں کرتے۔ جب وہ عطا کرتا ہے تو خوش ہوتے ہیں اور جب وہ کسی آزمائش میں ڈالتا ہے تو شکوے کرنے لگتے ہیں۔ یہ محبت کے اصول نہیں ہیں۔" مریم کے لہجے میں مٹھاس تھی۔ وہ خواب کی کیفیت میں گویا سن رہی تھی۔ سمجھ رہی تھی۔ اس کا دل گویا کسی نے مٹھی میں لے کر مسل ڈالا تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھی اور پھر کمرے میں بند ہو گئی۔

اس نے کتنے ہی شکوے کیے تھے اپنے اللہ سے۔ اسے اب معافی مانگنا تھی۔ سر جھکانا تھا۔ رونا گڑگڑانا تھا۔ وہ وضو کر رہی تھی اور اس کے آنسو بھی رواں تھے۔

اگلی صبح بہت مختلف تھی۔ شہرے نے ان کے ساتھ ناشتا بھی کیا تھا اور پھر بہت دنوں بعد ایمان کو بھی گود میں اٹھایا۔ وہ اسے پیار کر رہی تھی۔ چوم رہی تھی۔ اس کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ ایما خوش تھی' مریم مسرور تھی کہ شہرے آہستہ آہستہ ہی سہی زندگی کی طرف لوٹ رہی ہے۔

اور اسی صبح اس نے پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اپنے اس فیصلے سے ایما کو آگاہ کر چکی تھی اور ایئرپورٹ پر مریم نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"شہری جی! میں آپ کی کامیابی کے لیے دعا کروں گی۔"

"کیسی کامیابی۔" شہرے نے جان بوجھ کر انجان بن کر کہا تھا۔ مریم دھیمے سے مسکرا دی۔

"محبت میں کامیابی کی۔" ایما نے بھی مسکرا کر گفتگو میں حصہ لیا۔ کچھ دیر بعد جہاز آسمان کی وسعتوں میں گم ہونے لگا تھا۔ اور زمین پر کھڑی ان دو بھری عورتوں نے اس کی سچی خوشیوں کے لیے دل سے دعا کی تھی۔ جوان کی محسن تھی۔ جس نے انہیں سہارا دیا تھا۔

"شہری جی! آپ یاسر کے پاکستان جا رہی ہو۔ اس ہرجائی کے ملک کی ہوا کو بتا دینا کہ مریم اسے ہمیشہ کے لیے دل سے نکال چکی ہے۔" مریم نے چپکے سے اپنے آنسو صاف کیے تھے اور عائشہ کو سینے سے لگا لیا۔

یاسر اپنے وطن واپس گیا تو پھر لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ وہ اکثر دھیمی آواز میں ہندی میں گانا گنگناتی تھی۔ اور اس کی درد میں ڈوبی آواز ایما کا دل چھلنی کر دیتی تھی جو ہر شے سے بے نیاز گنگنا رہی ہوتی تھی۔

ہمیں چھوڑ دیا کس دیس گئے
پیا لوٹ کے آنا بھول گئے

☼ ☼ ☼

"شہری بیٹا! اٹھ جاؤ۔ صبح کے گیارہ بج رہے ہیں۔" کسی نے اس کے ماتھے پر بوسہ دے کر بالوں میں ہاتھ پھیرا تھا۔ اس نے مندی مندی آنکھیں کھول کر سمجھنے کی کوشش کی تھی کہ وہ اس وقت ہے کہاں۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد ذہن میں کلک کے ساتھ ہی سب کچھ روشن ہو گیا تھا۔ وہ ایک دم بستر سے اٹھی تھی۔ اس کے قریب ہی ثوبیہ آنٹی بیٹھی مسکرا رہی تھیں۔ شہرے شرمندہ سی اٹھی۔

"آپ نے مجھے جگایا کیوں نہیں۔ میں اتنی دیر تک کبھی نہیں سوئی۔"

"میں نے سوچا کہ تم بھرپور نیند لے لو۔ سفر کی تھکان بھی دور ہو جائے گی۔ اسی لیے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ عانیہ کے تین فون تو آچکے ہیں۔ تم سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔" آنٹی نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر ہولے سے دباتے ہوئے کہا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ شہرے کو یہاں آکر قطعا" اجنبیت کا احساس نہیں ہوا تھا۔ آنٹی اور انکل کے خلوص اور محبت سے وہ بہت متاثر ہوئی تھی مگر ابھی اس نے انہیں اپنے پاکستان میں قیام کا مقصد نہیں بتایا تھا۔ وہ عانیہ کو اس راز میں شریک کرنا چاہتی تھی۔ عانیہ سے فون پر بات کرنا مناسب نہیں تھا۔ اسی لیے وہ جلد از جلد کراچی پہنچنا چاہتی تھی۔

"میں ذرا فریش ہو لوں پھر عانیہ سے بات کروں گی۔" شہرے نے کچھ سوچتے ہوئے سلیپر پیروں میں ڈالے۔

"عانیہ اس وقت آفس میں ہوگی۔ تمہارے انکل اپنے دوست کی گاڑی لے آئے ہیں۔ ڈرائیور بھی آجائے گا۔ اب تم فٹافٹ تیار ہو کر آجاؤ۔" آنٹی نے مسکراتے ہوئے شفقت سے کہا۔ وہ بیمار تھیں مگر پھر بھی کس قدر ایکٹیو تھیں۔ شہرے سر ہلا کر واش روم میں گھس گئی۔

اس نے جلدی جلدی ہاتھ منہ دھویا' برش کیا اور پھر باہر آکر بال سلجھانے لگی۔ شہرے کا ذہن آنٹی کے چند الفاظ میں اٹک کر رہ گیا تھا۔

"عانیہ آفس میں ہوگی۔ تو کیا عانیہ جاب کرتی ہے۔ اس پہلو پر تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ خوامخواہ ایک مرتبہ پھر یونی ورسٹی کے لیے کانشس ہو رہی تھی۔ میں نے تاثم ہی پاس کرنا ہے نا۔ مصروف رہنے کے لیے پھر سے یونی ورسٹی جوائن کرنے کی بجائے مجھے

جاب کرلینی چاہیے۔ عانیہ ضرور میری اس معاملے میں مدد کرے گی۔ چاہے جیسی بھی جاب مل جائے۔ معمولی سی کم سیلری بھی ہو تب بھی چلے گی۔ مجھے کون سا پیسے کی ضرورت ہے۔ اسفند ماموں تک پہنچنے کے عرصے کے دوران اچھا ہے میں بھی مصروف رہوں گی۔ اور عانیہ کے ساتھ رہنے کا بہانہ بھی مل جائے گا۔ عانیہ یقیناً" ہاسٹل میں ہی رہتی ہے۔"

وہ سوچوں کے تانوں بانوں میں الجھی میز تک آئی تھی۔ اس نے ناشتے میں صرف دودھ لیا۔ آنٹی کے اصرار کے باوجود اس نے بریڈ کا پیس تک نہیں لیا تھا۔ اس نے جلدی جلدی دودھ پیا اور پھر کھڑی ہو گئی۔

"انکل کہاں ہیں؟ کیا وہ بھی جاب کرتے ہیں؟"

"نہیں بیٹا! وہ تو پانچ سالوں سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ اس وقت بل جمع کروانے اور پینشن لینے گئے ہیں۔" آنٹی برتن اٹھاتے ہوئے بتارہی تھیں۔ شہرے کچھ سوچ کر دوبارہ بیٹھ گئی۔

"آنٹی! عانیہ آپ کی اکلوتی بیٹی ہے؟"

"نہیں، ایک بیٹا بھی ہے۔" نجانے شہرے کو کیوں محسوس ہوا تھا کہ آنٹی کی آواز لڑکھڑا گئی تھی۔

"وہ کہاں ہوتا ہے؟ کیا پڑھتا ہے؟" شہرے نے ایسے ہی بات بڑھانے کی غرض سے پوچھ لیا تھا۔ آنٹی پھیکے سے انداز میں مسکرادیں۔

"اسی شہر میں ہے۔ اس کی شادی ہو چکی ہے۔ ماشاء اللہ سے انجینئر ہے۔ آئی ٹین ٹو میں ہمارا ذاتی دو منزلہ مکان ہے۔ اسی گھر میں رہتا ہے میرا بیٹا اپنی بیوی کے ساتھ۔"

"تو آپ وہاں ان کے ساتھ کیوں نہیں رہتیں؟" شہرے نے حیرانی سے پوچھا۔

"اس کی بیوی کو پسند نہیں ہمارا وہاں رہنا۔" اب وہ برتن دھونے لگی تھیں۔ شہرے نے دکھ کے عالم میں آنٹی کے کمزور وجود کی طرف دیکھا۔

"نجانے لوگ بیٹوں کی دعائیں کیوں کرتے ہیں۔" وہ رنجیدگی سے سوچ رہی تھی۔

"کیا اس وجود کو بیٹے کے سہارے کی ضرورت نہیں۔ یا پھر جھکے شانوں والے قاسم انکل کو۔ جو اس عمر میں آرام کرنے کے بجائے بل جمع کروانے کے لیے یقیناً" لائن میں کھڑے ہوں گے۔" شہرے آزردگی سے سوچتے ہوئے اٹھی تھی اور پھر برتنوں کو صاف کپڑے سے خشک کرکے شوکیس میں سجانے لگی۔

"گھر میں روز روز کی چخ چخ اور آئے دن کے جھگڑوں کی وجہ سے ہم دونوں نے یہ سوچا کہ بیٹا اور بہو کیوں گھر چھوڑیں ہم ہی وہاں سے نکل آتے ہیں۔ میری بہو ناعمہ بہت جھگڑالو اور بدزبان عورت ہے۔ وہ ان بدنصیب عورتوں میں سے ہے جنہیں "دعا" ملنا زہر لگتا ہے۔ شادی کے شروع دنوں میں جب میں اس کی گود بھرنے کی دعا کرتی یا پھر اس کے سامنے اظہار کرتی تو اسے آگ ہی لگ جاتی تھی۔ وہ مجھے عیار اور مکار عورت سمجھتی ہے، وہ کہتی ہے میں جادو کرتی ہوں۔ وظیفے کرتی ہوں، میری عبادت بھی اسے پسند نہیں تھی ہنسنا بولنا بات چیت کرنا۔ گھریلو معاملات میں دخل دینا حتی کہ کھانے پینے پر بھی اس نے پابندی لگا رکھی تھی۔ رات کو کچن کے دروازے پر تالا لگا دیتی تھی، سردیوں میں ہیٹر نہیں چلانے دیتی تھی اور گرمیوں میں اے سی پر پابندی۔ اگر کوئی مجھ سے ملنے آتا تو اس کی اتنی بے عزتی کرتی کہ پھر کسی کو ادھر آنے کی جرات ہی نہ ہوتی۔ ایسے حالات میں تمہارے انکل نے الگ ہو جانے کا فیصلہ کیا تھا اور پھر ہم اس کرائے کے فلیٹ میں شفٹ ہو گئے۔

عانیہ شروع سے ہی کراچی اپنی نانی کے پاس رہتی تھی۔ اماں کے مرنے کے بعد اس نے ہاسٹل میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ماسٹرز کے بعد وہ جاب کرنے لگی تھی۔ اسے ہماری تکلیفوں کا بہت احساس رہتا ہے۔ اسی لیے تو بیٹیاں رحمت ہوتی ہیں۔" انہوں نے کہا تھا اور پھر کرسی پر بیٹھ کر گہرے گہرے سانس لینے لگیں۔ یقیناً" گزرے وقت کی اذیتیں یاد آنے لگی تھیں۔

"آٹھ سال ہو گئے ہیں۔ ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم ہے۔"

"تو آپ کا بیٹا بھی نہیں آتا آپ سے ملنے۔" شہرے نے بے حد تاسف سے پوچھا۔

"وہ ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ اب سنا ہے کہ ایک ماہ پہلے وہ واپس آگیا ہے۔ مگر اس ذلیل عورت نے کبھی بھی اسے ہم سے ملنے نہیں دینا۔ نجانے کون سا بیر باندھ رکھا ہے اس نے مجھ سے میرے بیٹے سے ہم نے یہی سوچ کر الگ ہونے کا فیصلہ کیا تھا کہ بیٹا اور بہو تو خوش رہیں مگر ناعمہ نے میرے بچے کی زندگی بھی جہنم بنادی تھی۔ وہ میرے ساتھ لڑتا جھگڑتا تھا کہ میں نے اسے دوزخ میں پھینک دیا ہے۔ وہ بیوی کے روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آکر باہر چلا گیا تھا۔ وہ ہم سے کبھی بھی نہیں ملے گا۔ وہ مجھ سے خفا ہے، ناراض ہے۔ کیونکہ میں نے ہی ناعمہ کو اس کے لیے پسند کرکے بیٹے کو اور اپنے آپ کو برباد کر لیا ہے۔" آنٹی ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

"اس میں آپ کا کیا قصور ہے آنٹی!"

"اس کی ماں جو ہوں۔ یہی میرا جرم ہے۔" وہ دوپٹے سے آنسو پونچھ رہی تھیں۔ شہرے گلاس میں پانی لے آئی تھی اور پھر گلاس ان کے لبوں سے لگا دیا۔

"ارے میں بھی کون سی باتیں لے بیٹھی ہوں۔ نیچے ڈرائیور آگیا ہوگا۔ تم جاؤ، تھوڑی سی تفریح کرلو۔ پھر تم نے کراچی چلے جانا ہے۔ کلاسز اسٹارٹ ہونے کے بعد تو مصروف ہو جاؤ گی۔" آنٹی نے نرمی سے کہا تھا اور پھر کھڑکی میں سے نیچے جھانکا۔

"لو ڈرائیور آگیا ہے۔ بزرگ آدمی ہے۔ سارے شہر کے راستوں سے واقف ہے۔ تم اطمینان سے گھوم پھر لینا۔" شہرے بالوں کو بینڈ میں جکڑ کر بنک جاگرز کے تسمے کسنے لگی تھی۔ کھدر کا کرتا بلیو ٹراؤزر اور گلے میں بڑا سا اسکارف، بالوں کی اونچی سی پونی کیے وہ بہت اچھی لگ رہی تھی آنٹی نے دل ہی دل میں نظر اتاری۔

"حسنین کی بیٹی بہت خوب صورت ہے۔"

"اچھا آنٹی! اللہ حافظ۔" وہ ان کے سامنے جھکی تو انہوں نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ شہرے نے اپنا ڈیجیٹل کیمرہ گلے میں لٹکایا شولڈر بیگ ہاتھ میں پکڑا اور پھر تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی تھی۔

"لو اجنبی ہم تمہارے پاکستان تو پہنچ چکے ہیں۔ اب اگر تمہارا نام ہماری پیشانی پر ثبت ہوا تو تم کسی نہ کسی موڑ پر تو ٹکراؤ گے نا۔ یہی یقین مجھے دوسری دنیا سے کھینچ کر یہاں لے آیا ہے۔ مجھے خود پر اور اپنی اس یک طرفہ محبت پر بھروسہ ہے۔ اگر اللہ نے چاہا تو ہم ضرور ملیں گے۔ میں نے تمہیں اتنا سوچا ہے اتنا یاد کیا ہے اتنا چاہا ہے کہ خود کو بھی بھولنے لگی ہوں۔ ہے نہ احمقانہ سی محبت۔" وہ مسکراتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

چار پانچ گھنٹوں میں وہ دامن کوہ، لوک ورثہ، ہیری ٹیج میوزیم دیکھ چکی تھی۔ اب خان بابا اسے پھولوں کی نمائش کے متعلق بتا رہے تھے۔ گاڑی کا رخ یاسمین گارڈن کی طرف تھا۔

آدھے گھنٹے بعد راول ڈیم جا رہے تھے۔ تقریباً" تین بجے تک واپسی ہوئی تھی۔ بھوک سے اس کا برا حال تھا۔ اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی بابا سے کہا۔

"کسی ریسٹورنٹ میں چلیں۔"

"اچھا بی بی صاحب!" خان بابا نے سر ہلایا اور پھر کچھ ہی دیر بعد وہ پی سی کی پارکنگ میں گاڑی روک چکے تھے۔

"آپ بھی آئیں نا خان بابا!" وہ گاڑی میں سے باہر نکلتے ہوئے بولی تھی۔ خان بابا نے گھبرا کر نفی میں سر ہلایا۔

"ام کو بھوک ووک نہیں ہے۔ آپ جاؤ ام ادھر بیٹھ کر پان کھاتا ہے۔"

"اوکے۔" شہرے نے مزید اصرار نہیں کیا تھا۔ بالکل ندیدوں کی طرح کھانا کھاتے ہوئے وہ اردگرد سے قطعا" بے نیاز تھی۔ کھانا بہت مزے کا تھا یا پھر بھوک ہی بہت شدید تھی۔ اس نے ویٹر کو آواز دی تھی اور پھر مزید آرڈر نوٹ کروایا۔

"چائنیز اٹو کے ساتھ ٹماٹو اینڈ منٹ کی ساس لانا۔ اور مٹن ود ٹماٹو کے ساتھ چائنیز پلاؤ پیک بھی کروالاؤ۔ بے چارے خان بابا بھوکے بیٹھے ہوں

گے۔" آخر میں خود کلامی کی گئی تھی۔ سو یٹر دانت نکال کر اثبات میں سر ہلانے لگا۔

"کچھ اور میم!"

"ہاں' بات سنو۔ یہاں سے گول گپے مل جائیں گے؟" اس کے لہجے میں اشتیاق کے ساتھ ہلکی سی بے تابی تھی۔ ویٹر کے تاثرات سے اسے جواب مل گیا تھا۔ اسی لیے کچھ بھنا کر پلیٹ پر جھک گئی تھی اس بات سے بے نیاز کہ برابر موجود ٹیبل کے اردگرد بیٹھے کچھ نفوس بہت ہی دلچسپی کے عالم میں اسے دیکھ رہے تھے۔ اس سب کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

ان نگاہوں کی تپش نے ہی اسے سر اٹھانے پر مجبور کیا تھا۔ جوں ہی اس نے دائیں اور پھر بائیں جانب دیکھا تو زمین و آسمان گویا گول گول گھومنے لگے تھے۔ وہ ایک ٹک دم بخود سی اسے دیکھ رہی تھی۔ اور پھر ایک دم ہوش میں آکر اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے تھے اور آنکھیں موند کر زور و شور سے دعا کرنے لگی۔

"ہائے اللہ جی! یہ تو وہ ہی ہے۔ ہائے میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہی۔ اللہ جی! میری دعا اتنی جلدی قبولیت کا درجہ پا گئی ہے۔ کیا ایسے بھی سر راہ کوئی مل سکتا ہے۔ کسی سے محبت ہو سکتی ہو؟ کوئی دل کے اتنا قریب ہو سکتا ہے کہ ہر چہرے میں بس اسی کا چہرہ نظر آئے۔" اب وہ کپکپاتے ہونٹوں پر ہاتھ پھیر کر پھر سے بائیں طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ وہ تین لڑکوں اور لڑکیوں پر مشتمل گروپ تھا۔ اور وہ ابھی تک اس کی عجیب و غریب حرکات دیکھ کر مسکرانے کے ساتھ ساتھ محظوظ ہو رہے تھے۔

"یہ لوگ مجھے دیکھ کر کیوں ہنس رہے ہیں؟ اور وہ بھی تو مسکرا رہا ہے اور مجھے ہی مسلسل دیکھ بھی رہا ہے۔ نجانے کیا نام ہے اس کا کاش کہ میں اس کا نام جان سکتی ابھی اسی پل اسے لندن کی اس شام کے متعلق بتا سکتی جس نے مجھے اسیر محبت کیا تھا۔" وہ سوچوں کے تانوں بانوں میں الجھی چور نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ اور کتنے لوگ تھے اور وہ کون تھے۔ شہرے نے جاننے کی کوشش نہیں کی تھی وہ تو بس نگاہوں کے راستے اسے دل میں اتار لینا چاہتی تھی۔ تب ہی ایک سرگوشی نما آواز اس کے کان میں پڑی۔

"زارون! تجھے دیکھ کر یہ لڑکی تو گئی کام سے۔ ہم لوگ بس لعنت بھیج کر جا رہے ہیں۔ آئندہ کہیں بھی تمہیں ساتھ لے کر نہیں جانا۔ ہماری اتنی اچھی پرسنالٹی تمہارے سامنے ڈاؤن ہو کر رہ جاتی ہے۔" مونس جل بھن کر کہہ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اسی شام وہ لوگ واپس کراچی آگئے تھے۔ ان سب کے مشترکہ دوست انس کی ویڈنگ اینی ورسری تھی۔ اسی لیے وہ سب اپنے تمام ضروری کام چھوڑ کر اسلام آباد آگئے تھے کیونکہ انس کو چھوٹی چھوٹی باتوں پر روٹھنے کی بیماری تھی۔ اس دفعہ عدن کے مشورے پر ان سب نے انس کو مختلف پیکنگ میں لپٹے ایسے گفٹ دیئے تھے جنہیں کھولنے کے بعد وہ دانت کچکچاتا ضرور گالیوں سے نواز رہا ہوگا۔ اس بات کا تو ان سب کو پورا پورا یقین تھا۔ اسی لیے مونس نے اسے بڑے دلار سے کہا تھا۔

"یار انس! جب ہم لوگ جہاز میں بیٹھ جائیں گے تب تم اور بھابھی دونوں ہمارے گفٹس کھول کر دیکھنا اور ہمیں دعائیں بھی دینا کیونکہ تمہارے فیوچر کے کچھ اخراجات ہم سب نے مل بانٹ کر کم کر دیئے ہیں۔"

"دوست ہوں تو ہمارے جیسے پہلے سے ہی اپنے یار کے کچھ بردن کو ہم نے کم کرنے کی کوشش کی ہے۔" زین نے بھی زارون کو آنکھ مار کر کہا۔

"بس ہسپتال کا بل تم کلیئر کرنا۔" یہ سویٹی تھی جو عدن کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس رہی تھی۔

"یہ کیا ان ڈبوں میں۔ بہت ہلکے لگ رہے ہیں۔" انس ان کی لن ترانیوں سے چڑ گیا۔

"میری جان! گھر جا کر دیکھ لینا ابھی تو ہمیں اجازت دو۔" زارون اس کا کندھا تھپک کر گاڑی کی

طرف بڑھ گیا تھا۔ وہ سب اس کے پیچھے ہنستے ہوئے آگے تھے۔ اور اب زارون کے گھر میں اس کے بیڈ روم میں صوفے پر لیٹا مونس ہنس ہنس کر دوہرا ہو رہا تھا۔ جبکہ زارون سیل فون کان سے لگائے اپنی صفائیاں پیش کر رہا تھا۔ دوسری طرف سے ہنوز گولہ باری جاری تھی۔

"بے شرمو! بچ کر نکل گئے ہو میرے ہاتھ سے۔ چھوڑوں گا نہیں میں تم لوگوں کو۔ حد ہوتی ہے کنجوسی کی۔ میں جو مہنگی مہنگی شرٹس' کچھ نئی نکور جینز اور سات آٹھ ہزار والے جوتوں اور امپورٹڈ پرفیوم کی چاہ میں اتنا خرچہ کر چکا ہوں۔ میری جیب کا کباڑا ہو گیا ہے۔ ذلیلو! زندہ نہیں چھوڑوں گا میں تم سب کو بے شرم! ذرا بھی حیا نہیں آئی۔ دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے۔ جو چھوٹے چھوٹے ڈبے میرے منہ پر مار کر چلے گئے ہو۔ اور ان میں سے برآمد کیا ہوا ہے۔ فیڈر' چوسنیاں' بے بی ہاؤس' بے بی ڈریسز' کینڈیز اور چاکلیٹس میرا ہارٹ فیل ہونے لگا تھا۔" انس کی دہائیاں زور و شور سے جاری تھیں۔ اس کی آواز فون سے باہر تک آ رہی تھی۔ اب کے زارون کو بھی غصہ آگیا۔

"کمینگی کی حد ہوتی ہے۔ ہمارا کھایا پیا گن رہے ہو۔ نہ جانے کس نیت سے ڈنر کروایا تھا تم نے۔ ہم سب تو بیمار بستروں میں پڑے تمہاری ویڈنگ اینی ورسری کو رو رہے ہیں۔" زارون نے مونس کو اشارہ کر کے حساب برابر کیا تھا۔ دوسری طرف وہ ابھی تک جل بھن رہا تھا۔

"تمدیدے انسان نہ مر جانا۔ آج شام کو ہماری طرف سے تمہیں کئی پارسل ملیں گے۔" زارون نے اسے مزید ستانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ دوسری طرف گویا سکھ کا سانس لیا گیا۔ سوکھے دھانوں پر چھینٹے پڑے تھے۔ اب وہ مسکرا مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

"تم لوگوں کے گفٹس تو بہت اچھے تھے۔ روا کو بہت پسند آئے تھے۔ اس نے انہیں سنبھال کر رکھ لیا ہے مگر ابھی تک تم لوگوں کے چاچو بننے کے آثار نظر نہیں آ رہے۔"

"اب آئے ہو لائن پر۔" زارون نے مسکرا کر سیل آف کیا تھا اور پھر لوٹ پوٹ ہوتے مونس کی طرف متوجہ ہوا۔

"میں نے تمہاری اور عدن کی جان بخشی کروا دی ہے۔ ابھی اس نے تم دونوں کی کلاس بھی لینی تھی۔"

"ویسے یار زارون! ہمارا اسلام آباد جانا مبارک ثابت ہوا ہے۔" مونس نے کشن بازوؤں میں دبوچ کر شریر انداز میں کہا تھا۔ وہ ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھنے لگا۔

"کیا مطلب!"

"بھئی مجھے تو پی سی میں گول گپوں کی شوقین حسینہ کی وہ نظریں نہیں بھول رہیں جو تمہیں فدا ہونے والی نگاہوں سے تک رہی تھی۔ یار! کیسے دھنک کے رنگ پھیلے تھے اس کے چہرے پر۔ کوئی نئے بھید کھل رہے تھے۔ راز افشا ہو رہے تھے۔ ان آنکھوں کا مفہوم کچھ اور تھا۔ تم نے غور نہیں کیا جب وہ ایک دم ہماری طرف متوجہ ہوئی تو صرف ایک تمہارے چہرے پر اس کی نگاہ ٹھہری تھی۔ ان اٹھتی پلکوں والی آنکھوں کے رنگ دیکھے تھے۔ پہلے حیرت پھر خوشی اور پھر بے تحاشا خوشی تھی۔" مونس بہت تول تول کر اور سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔ وہ خاموش ہوا تو زارون نے بے چینی سے پوچھا۔

"کیا سوچ رہے ہو مونس! آگے بھی بولو۔"

"تم نے دیکھا تھا زارون! اس نے دعائیہ انداز میں ہاتھ پھیلائے تھے۔ اس کی آنکھوں میں تشکر اور خوشی کے ساتھ اک محبت بھری چمک بھی تھی۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" زارون نے حیرت سے کہا۔

"ویسے تو بڑے زیرک بنتے ہو۔ اتنی چھوٹی سی بات تمہیں سمجھ نہیں آ رہی۔ وہ لڑکی تمہیں پہلے سے جانتی ہے۔ اس نے یقیناً پہلے بھی کہیں تمہیں دیکھ رکھا ہے اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ادھر معاملہ دل کا ہے۔" مونس وثوق سے بولا۔

"مگر کہاں؟ میں نے تو اسے فرسٹ ٹائم دیکھا

ہے۔" زارون نے حیرانی سے کہا۔ وہ تو خود اس لڑکی کے تاثرات دیکھ کر ششدر تھا۔ کم و بیش ایسی ہی باتیں اس نے کئی مرتبہ سوچی تھیں اور اس پہلو پر بھی غور کرتا رہا تھا۔ مونس ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس لڑکی کے تاثرات نظرانداز کیے جانے والے نہیں تھے۔

"یار! ایک غلطی ہوئی ہے۔" مونس نے تاسف سے کہا۔

"کون سی غلطی؟" وہ مونس کی طرف چونک کر دیکھنے لگا تھا جو کہ پرسوچ نظروں سے سامنے لگی پینٹنگ کو بغور تک رہا تھا۔

"اس لڑکی کا اتا پتا معلوم کرلینا چاہیے تھا۔"

"کیوں؟" زارون نے ناگواری سے پوچھا۔

"بس ایسے ہی اس کی آسانی کے لیے کہہ رہا ہوں۔ وہ بھی شاید کچھ ایسا ہی اس وقت سوچ رہی تھی۔ اگر ہم تھوڑی دیر اور نہ اٹھتے تو اس نے تم سے ایڈریس یا فون نمبر تو ضرور مانگ لینا تھا۔" مونس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

"کسی کے بارے میں بغیر جانے فضول کمنٹس نہیں دیتے۔" زارون نے سنجیدگی سے کہا۔

"مگر میں تو چند لمحوں میں ہی اس کے اندر تک کے "بھید" کو جان چکا ہوں اور منہ پر نہ سہی خود تم بھی میری ہر بات سے اتفاق کرتے ہو۔" مونس مسکرایا۔

"کون سی بات؟" اس نے جزبز ہو کر پوچھا۔

"یہی کہ وہ لڑکی تم سے یعنی زارون اسفندیار سے محبت کرتی ہے۔"

"بکو نہیں۔" اس نے غصے سے کہا تھا۔ مونس مسلسل مسکراتا رہا۔

"میں سچ بول رہا ہوں۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ مونس فریدون کا مشاہدہ کبھی غلط ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے چہرے پر بڑی واضح تحریر لکھی تھی کہ مجھے تم سے محبت ہے دیوانگی کی حد تک۔" مونس باقاعدہ ٹیبل بجا بجا کر گا رہا تھا اور پھر ایک دم ہی چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ مونس اس سے کچھ کہنا چاہتا پھر لب بھینچ کر خاموش ہوگیا۔

وہ اس وقت عدن کے بارے میں سوچ رہا تھا جو کہ زارون سے شدید محبت کا دعوا کرتی تھی مگر زارون اس بارے میں خاموش تھا۔ اس نے کبھی تردید یا تائید نہیں کی تھی۔

✲ ✲ ✲

"کیا میں اسے ایک مرتبہ پھر دیکھ چکی ہوں۔" شہرے کو ابھی تک یقین نہیں آیا تھا۔ وہ بار بار خود کو یقین دلانے کی کوشش کررہی تھی۔ خوشی اور سرشاری اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ اس کے دوست مونس نے اس کا نام زارون لیا تھا۔ اور شہرے نے کتنی ہی مرتبہ اپنے لبوں سے اس نام کو ادا کیا تھا۔ آنٹی بھی اسے معمول سے زیادہ خوش دیکھ کر حیران تھیں۔ ان کے خیال میں سفر کی تھکان اتر جانے کی وجہ سے وہ فریش نظر آرہی تھی۔ اور خود شہرے بھی بڑے وثوق سے انہیں باور کروا رہی تھی کہ "آنٹی یوں لگ رہا ہے مسافتوں کی تھکن نے کبھی وجود کو چھوا تک نہیں۔" رات کو انکل اس کی فیوچر پلاننگ کے متعلق پوچھ رہے تھے۔

"شہری بیٹا! کیا تم ماسٹرز کرنا چاہتی ہو؟"

"نہیں انکل! اب میں نے ارادہ بدل لیا ہے۔ کیونکہ میں ایم بی اے کرچکی ہوں۔ اب اور پڑھ کر کیا کروں گی۔ میرا خیال ہے مجھے جاب کرلینی چاہیے۔" وہ انکل سے جھوٹ نہیں بول سکی تھی۔

"اب تم یہیں رہو گی نا۔" آنٹی نے پوچھا۔

"ہوں۔" وہ پرسوچ انداز میں بولی۔

"حسنین کی خواہش تھی تم پاکستان میں ہی رہو۔" آنٹی کپڑوں کے ڈھیر کو دری پر رکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"انکل! سیٹ کنفرم ہوگئی ہے؟"

"کل آٹھ بجے کا ٹائم ہے۔" انہوں نے اخبار پر سے نگاہ ہٹا کر جواب دیا۔

"کچھ دن اور رہ لیتیں۔" آنٹی نے محبت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرا بھی اچھا وقت گزرنے لگا تھا۔"

"آنٹی! اصل میں مجھے کراچی ضرور جانا ہے کیونکہ وہاں میرا ایک کام ہے۔ اسی کام کے سلسلے میں ہی میں آئی تھی۔" اس نے مسکرا کر ان کے گلے میں بانہیں ڈال دی تھیں۔ اسی پل عانیہ کا فون آگیا۔

"کب آرہی ہو؟" انکل سے بات کرنے کے بعد عانیہ نے اس سے بات کرنا چاہی تھی۔

"کل شام تک پہنچ جاؤں گی۔" وہ عانیہ کو بتانے لگی تھی۔ ساتھ میں اس نے جاب کی بھی بات کرلی۔

"تمہیں جاب کی کیا ضرورت ہے؟" عانیہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"بس مصروف رہنے کے لیے جاب کرنا چاہتی ہوں۔"

"تم آؤ گی تو پھر اس بارے میں بھی سوچیں گے۔" عانیہ نے حامی بھرلی۔ اس کی آدھی ٹینشن دور ہوچکی تھی۔

اسی شام وہ کچھ شاپنگ کی غرض ایف ٹین مارکیٹ چلی آئی تھی۔ کچھ ضروری اشیاء خریدنے کے بعد ایک مرتبہ پھر فیصل مسجد کو دیکھنے کے لیے چلی گئی۔ جدید دنیا کے سات عجائبات میں ایک فیصل مسجد کا نام بھی تھا۔ اس کی خوب صورت اور طرز تعمیر سے اس کی آنکھیں خیرہ ہورہی تھیں۔ کافی دیر ادھر ادھر ٹہلنے کے بعد وہ واپس آگئی۔ رات کو دیر تک وہ آنٹی کے ساتھ باتیں کرتی رہی تھی۔

دوسرے دن آنٹی نے عانیہ کے لیے کچھ کپڑے اور دو تین قسم کے حلوے تیار کرکے اسے دیے تھے۔ اسی شام وہ کراچی آگئی تھی۔ عانیہ ائیرپورٹ پر اسے لینے کے لیے آئی تھی۔ ٹیکسی کے ذریعے وہ ہوسٹل پہنچی تھیں۔ عانیہ نے اس کے لیے چائے پر کافی اہتمام کر رکھا تھا۔

"بڑی مشکل سے ایک گھنٹے کی چھٹی ملی تھی۔ بڑی مغرور باس ہے ہماری سوائے رعب جھاڑنے اور اگلے بندے کی بے عزتی کرنے کے علاوہ کچھ نہیں آتا۔" چائے پی کر عانیہ اسے اپنی بددماغ باس کے متعلق بتانے لگی۔

"میری جاب کا کچھ بندوبست ہوا؟" اس نے بےتابی سے پوچھا۔

"تم تو ایسے ری ایکٹ کررہی ہو شہری! کہ تم سے زیادہ مجبور اور ضرورت مند کوئی نہیں۔" عانیہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ شہرے سنجیدگی سے بولی۔

"تم مجھے بھی ضرورت مند ہی سمجھ لو۔"

"بابا! اکرلیں گے کچھ، تم سانس تو لو۔ ابھی تمہیں کراچی دکھاؤں گی۔۔۔ کچھ دن آرام کرو پھر جاب کی تلاش شروع کریں گے۔" عانیہ نے اس کا ہاتھ تھپتھپا کر کہا۔

"تلاش۔۔۔ یعنی کہ ابھی تم نے میرے لیے نوکری تلاش کرنی ہے۔ پھر کرچکی میں اپنا ایڈونچر پورا۔" شہرے نے آنکھیں پھیلائیں۔ اور دھپ سے بیڈ پر لیٹ گئی۔

"تو بھئی کمال کرتی ہو۔ اتنی آسانی سے تمہارے شان شایان جاب کا بندوبست کرنا کوئی معمولی بات ہے۔" عانیہ نے خفگی سے کہا۔

"میں نے ایک دو کولیگز سے کہہ رکھا ہے۔ ان شاء اللہ جلد کام ہوجائے گا۔" عانیہ نے اسے تسلی دی۔

"اف عانیہ! میری ڈیمانڈ کوئی اتنی اعلا نہیں ہے۔ بس نارمل سی کم سیلری پر جو بہت ہی آسانی سے فافٹ جاب مل جائے۔ بس اس کا انتظام کردو۔" شہرے نے لجاجت سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"کیا مطلب، کسی اسکول کی ماسی کی جاب کرنا چاہتی ہو۔" عانیہ نے صدمے سے نڈھال آواز میں کہا تھا۔ شہرے اپنی جلدبازی پر اظہار افسوس کرنے لگی۔

یونہی بہت سارے دن گزر گئے تھے مگر شہرے کا مسئلہ ہنوز برقرار تھا۔ وہ سارا دن عانیہ کا انتظار کرتے کرتے بور ہونے لگی تھی۔ ناشتے کے بعد کمرے کی صفائی ستھرائی اور پھر اخبار چاٹنے بیٹھ جاتی۔ ایک دو جگہ انٹرویو دینے کا سوچا بھی تھا مگر پھر ہمت ہی نہ ہوئی۔ وہ یہاں اس نئے شہر میں کسی کو جانتی تک نہیں تھی۔ راستوں کا اسے پتا نہیں تھا اور پھر ایسے ہی تو بغیر گارنٹی کے منہ اٹھا کر وہ کہیں بھی انٹرویو دینے نہیں جاسکتی

تھی۔ آج عانیہ کے آنے سے پہلے اس نے تقریباً" دو گھنٹے ایما اور مریم سے فون پر بات کی تھی۔
"تمہیں کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی جاب کے لیے دھکے کھانے نکل پڑنا۔ آرام سے ہوم لینڈ میں عیش کرو۔ جو تمہارا نہیں' اس کے لیے اپنے قیمتی آنسو کیوں ضائع کر رہی ہو۔ تمہاری ایک پیاری سی بیٹی ہے۔ اس کی بہت اچھی تربیت کرو۔ تمہارے پاس جینے کا ایک بہترین جواز موجود ہے۔" وہ اسے پیار سے نرمی سے سمجھا رہی تھی۔
"ہاں' میں اسے شہری کی طرح بناؤں گی۔ وہ بالکل تمہارا پرتو لگے گی۔" مریم عائشہ کو سینے سے لگا کر بولی۔
"ایما سے بات کروا دو۔"
"شکر ہے میرا بھی خیال آیا ہے آپ کو۔" ایما نے مریم سے ریسیور جھپٹ کر طنزیہ انداز میں کہا۔
"ایما! میں نے اسے پھر سے دیکھ لیا ہے۔"
"سچ' صرف دیکھا ہے۔ بات نہیں کی' کم از کم نام تو پوچھ لیتیں۔" ایما نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے تھے۔
"چھری تلے دم لو' بتاتی ہوں۔۔۔" وہ سرگوشیانہ بولی تھی اور پھر دھیرے سے مزید کہنے لگی۔
"اس کا نام زارون ہے۔ اور میں نے اسے اسلام آباد میں دیکھا تھا۔ وہ اپنے دوستوں کے ہمراہ تھا اگر اکیلا ہوتا تو ضرور بات کر لیتی۔"
"تم اس وقت کہاں ہو؟"
"میں عانیہ کے پاس کراچی میں ہوں۔"
"تم کراچی میں کیا کر رہی ہو؟ تمہیں اسلام آباد میں ہونا چاہیے تھا۔ اور پھر تم زارون تک کیسے پہنچ سکو گی۔" ایما کے لہجے میں پریشانی جھلک رہی تھی۔
"پہلے ممی کے ممی' پاپا کو تو ڈھونڈ لوں۔۔۔ پتا نہیں میں ان سے مل پاؤں گی بھی کہ نہیں۔" اس کی آواز میں نمی سی چھلکنے لگی۔
"تم کیسے انہیں ڈھونڈو گی۔ لاکھوں انسانوں کی اس بھیڑ میں اپنوں کو کھوجنا آسان تو نہیں۔" ایما اس کی رنجیدگی کو محسوس کر چکی تھی۔ کچھ دیر مزید بات کرنے کے بعد اور فیکٹری کے متعلق مسٹر پال کے لیے چند ایک ہدایات دے کر اس نے فون رکھ دیا تھا۔ اب وہ بالکل چت لیٹی نم آنکھوں سے سوچ رہی تھی۔ اس کا ذہن کئی حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ وہ اس وقت خود کو بالکل تنہا سمجھ رہی تھی۔ اس بھری دنیا میں کوئی بھی خون کا رشتہ موجود نہیں تھا۔ اس کے ددھیال میں بھی کوئی دور نزدیک کا رشتہ دار نہیں تھا۔ پہلے وہ کچھ پرامید تھی کہ شاید وہ اپنے نانا' نانی تک پہنچ جائے گی مگر کراچی آکر تو آس کا دامن چھوٹ گیا تھا۔ اتنا بڑا شہر اور وہ خود ہر راستے سے انجان بھلا کیسے اپنے نانا' ماموؤں سے مل پائے گی۔
"تو کیا میرا سفر لاحاصل رہے گا۔" وہ زیر لب بڑبڑائی تھی اور پھر اضطراب کے عالم میں اٹھ کر کھڑکی کھولے باہر کے دوڑتے بھاگتے' سانس لیتے مناظر کو دیکھنے لگی۔
"کہاں گم ہیں شہرے حسنین صاحبہ!" عانیہ دبے قدموں سے چلتی ہوئی اس کے پیچھے آن کھڑی ہوئی تھی۔ شہری نے چونک کر رخ بدلا۔
"تم کب آئی ہو؟"
"ابھی دو منٹ پہلے۔" وہ اپنا پرس میز پر پھینک کر صوفے پر ڈھے گئی تھی۔
"چائے لاؤں تمہارے لیے؟" شہرے نے نرمی سے پوچھا تھا۔ کس قدر تھکی تھکی سی لگ رہی تھی عانیہ۔
"نیکی اور وہ بھی پوچھ پوچھ۔" اس نے بے تکلفی سے کہا۔ شہرے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی تھی۔ سیڑھیاں اتر کر اس نے کچن میں قدم رکھا اور پھر کسی کو موجود نہ پا کر جلدی جلدی چائے بنانے لگی تھی۔
یہ ایک پرائیویٹ ہاسٹل تھا۔ تین منزلہ کوٹھی پر مشتمل۔۔۔ ہاسٹل کا لان بھی کافی وسیع و عریض تھا۔ ہاسٹل کی مالک خاتون بیوہ تھیں۔ ایک بیٹی کو بیاہ کر اب ٹائم پاس کرنے اور تنہائی دور کرنے کے لیے انہوں نے اپنی وسیع و عریض کوٹھی کو ہاسٹل بنا دیا تھا۔ کھانا پکانے کے لیے ایک مائی آیا کرتی تھی البتہ

چائے وغیرہ سب کو خود بنانا پڑتی تھی۔ اس وقت شہرے سمیت بیس خواتین یہاں رہ رہی تھیں۔ چونکہ سب ہی ورکنگ لیڈیز تھیں لہٰذا شہرے بھی اپنے لیے نوکری کی درخواست "فوراً" سب کے سامنے رکھ چکی تھی مگر نتیجہ ہنوز وہی تھا۔ اب تو شہرے کو یقین ہو چکا تھا کہ اس کے لیے کسی آفس کے چپڑاسی کی جاب بھی نہیں ہے۔ وہ فارغ رہ رہ کر اکتا چکی تھی۔ وہ تو بہت ایکٹو لڑکی تھی۔ ہر وقت متحرک رہتی۔ اس نے کئی ملکوں کی سیر کی تھی۔ اس میں بلا کا کانفیڈنس تھا۔ وہ اسکول' کالج اور یونیورسٹی کی بہترین اسٹوڈنٹ رہی تھی۔ اور اس وقت کسی معمولی جاب کے حصول کے لیے یوں ہر ایک کی منتیں کر رہی تھی۔
چائے کو دم دے کر اس نے ایک ٹرے میں دو مگ رکھے اور پھر کچھ دیر بعد ٹرے سمیت اوپر آگئی۔

☼ ☼ ☼

"آج سنڈے ہے اور تم فارغ ہو۔ لہٰذا میرے ساتھ چلو' مجھے گاڑی خریدنا ہے۔" وہ کپڑے چینج کر کے اپنا مخصوص ہیر اسٹائل یعنی اونچی سی پونی بنا رہی تھی۔
"گاڑی' مگر کیوں؟" عانیہ نے حیرانی سے پوچھا۔
"گاڑی کیوں خریدتے ہیں سہولت کے لیے نا۔" مصروف انداز میں جواب دیا گیا تھا مگر عانیہ کی تشفی نہیں ہوئی تھی۔
"تمہیں کیا ضرورت ہے کار کی۔ خوامخواہ پیسے ضائع کرو گی۔"
"بابا! نو ایڈوائز۔۔۔ اب کوئی سوال نہیں ہونا چاہیے۔ اور ویسے بھی اپنی گاڑی ہو گی تو کہیں بھی آنے جانے میں آسانی رہے گی بلکہ میں تمہیں روزانہ آفس چھوڑنے جایا کروں گی۔ یعنی کہ میں بخوشی تمہاری ڈرائیور کی جاب قبول کر رہی ہوں۔ اس سے اچھی نوکری مجھے کہیں بھی نہیں ملے گی۔" اس نے شولڈر بیگ اٹھایا۔ زپ کھول کر کرنسی چیک کی تھی اور پھر مطمئن ہو کر کھڑی ہو گئی۔
"ماشاء اللہ سے مجھے آفس ڈراپ کیا کریں گی اور واپسی پر "بنت حوا" تک آتے آتے راستہ بھول جانا ۔۔۔ تم تو ابھی تک سامنے والی مارکیٹ تک اکیلے نہیں جا سکیں۔" عانیہ نے لطیف سا طنز کیا تھا۔ شہرے ڈھٹائی سے ہنس پڑی۔ کچھ کچھ شرمندگی کا عنصر بھی نمایاں تھا۔
"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ مارکیٹ تک میں جا سکتی ہوں اور واپس آنے کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ دو گلی چھوڑ کر رتن جوت کا درخت ہے۔ اس کی سائیڈوں پر گول دائرے کی شکل میں سفید گرل لگی ہے اور اس سے آگے "بنت حوا" کا سائن بورڈ۔۔۔ لو اب میں ہاسٹل پہنچ چکی ہوں۔" شہرے نے مزے سے کہا۔
"امی نے مجھے ایک سو بیس مرتبہ تاکید کی تھی کہ شہری کو تنہا کہیں بھی مت نکلنے دینا۔" اس کے اصرار پر عانیہ سینڈل نکال کر پہنتے ہوئے بول رہی تھی۔
"ابھی تو تم میرے ساتھ جا رہی ہو۔" شہرے مسکرائی۔
پورا شوروم اوپر نیچے گھومنے کے بعد شہرے کو ایک بلیک کرولا پسند آگئی۔
"تم مہران یا آلٹو لے لو۔ اتنی مہنگی گاڑی کی کیا ضرورت ہے۔"
"ہائے تمہیں۔ بالکل صابن دانی لگتی ہیں۔ اس ڈبیہ میں تو میرا سانس ہی گھٹ جائے گا۔" شہرے نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔ عانیہ اثبات میں سر ہلانے لگی۔ ایک بینک سے اس نے کرنسی چینج کروائی تھی پھر پے منٹ کے بعد وہ دونوں باہر آگئیں۔
شہرے اپنے ہی دھیان میں عانیہ سے باتیں کرتے انٹرس کے ان ڈور کو کھول رہی تھی جب "آؤٹ سائیڈ" کا گلاس ڈور کھلا اور زارون ایک ماڈرن اور بے حد حسین لڑکی کے ہمراہ باہر نکلا۔ وہ اپنی دھن میں مگن سیڑھیاں اتر کر پارکنگ کی طرف جا رہے تھے جبکہ شہرے گم سم سی ساکت کھڑی انہیں دیکھتی رہ گئی۔
"شہری! کیا ہوا ہے؟ کیا تم انہیں جانتی ہو؟" عانیہ

نے شہرے کی نظروں کی تعاقب میں دیکھ کر کچھ عجیب سے انداز میں پوچھا۔

"آں... ہاں۔" وہ چونکی تھی اور پھر سرگوشی نما آواز میں بولی۔

"یہ زارون تھا مگر اس کے ساتھ کون لڑکی ہے۔" وہ مسلسل ذہن پر زور دے رہی تھی۔ اس کی یادداشت چہرے محفوظ رکھنے کے بارے میں بہت اچھی تھی اور اسے یاد آگیا تھا کہ اسی لڑکی کو اس نے اسلام آباد میں زارون کے ساتھ دیکھا تھا۔

"کہیں یہ لڑکی اس کی بیوی تو نہیں۔" اس سوچ نے شہرے کو پل بھر میں بالکل سرد کر دیا تھا۔

"اف' اس پہلو پر تو میں نے غور ہی نہیں کیا۔ اگر یہ زارون کی بیوی ہوئی تو پھر... میری یک طرفہ محبت لگتا ہے اپنے انجام کو پہنچنے والی ہے۔" ایک دم ہی کچھ دھند سی آنکھوں کے پار اترنے لگی۔

"میں بھی کسی قدر احمق ہوں۔" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

"مگر اس کی شکل اسفند ماموں سے بہت ملتی ہے۔ کیا پتا یہ ان کا..." وہ مزید کچھ اندازے لگانے سے پہلے سر جھٹکنے لگی تھی۔ انہی خوش فہمیوں نے تو اسے نڈھال کر دیا تھا۔

"بہت سے انسانوں کے نقوش ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ سب ایک دوسرے کے کچھ نہ کچھ لگتے ہی ہوں... اور پھر ایک پچیس سال پرانی تصویر کو دیکھ کر کوئی بھی اندازہ لگانا ایک احمقانہ فعل ہے مگر پھر بھی میرا دل کچھ اور ہی کہتا ہے اور چھٹی حس کے ہنٹس بھی کچھ غلط نہیں ہو سکتے۔" شہرے سوچوں کے تانوں بانوں میں الجھی نہ جانے کہاں پہنچ گئی تھی جب عانیہ نے اسے کندھا ہلا کر اپنی طرف متوجہ کیا۔

"شہرے! کہاں کھو گئی ہو۔ ہم لوگ اس وقت پبلک پلیس پر کھڑے ہیں۔"

"تم نے زارون کو دیکھا ہے عانیہ! یوں سمجھ لو' نانا' نانی سے ملنے کے علاوہ میری زندگی کی دوسری بڑی خواہش اس شخص کا حصول ہے جو کہ بالکل ناممکن لگتا ہے۔" وہ اب بھی سرگوشی میں بول رہی تھی۔

"لندن سے ملائشیا اور صباح سے پاکستان' یہاں سے لے کر وہاں تک مجھے شہرے حسنین کو اس ایک چہرے کے علاوہ کوئی اور چہرہ دکھتا ہی نہیں۔ تمہیں میری باتیں دیوانوں کی سی لگیں گی مگر یہی سب سے بڑا "سچ" ہے کہ میرا دل زارون کی طرف خود بخود کھنچتا ہے۔ اک مقناطیسی کشش ہے۔ یہ دل کے تقاضے سمجھنا بہت مشکل ہے۔ مجھے خود پر کبھی کبھی بہت حیرانی ہوتی ہے کہ میں شہرے حسنین کس قسم کی احمقانہ محبت میں گرفتار ہو چکی ہوں۔ اس محبت کی داستان کے دوسرے فریق کو خبر تک نہیں کہ کوئی لندن کی اس سلونی شام کے "بار" کو اٹھائے کئی چمکتی دمکتی دنیاؤں کو چھوڑ کر یہاں تک پہنچ چکا ہے۔ تم نے کبھی ایسی محبت کے بارے میں سنا ہے عانیہ!"

"شہری! تم زارون کو جانتی ہو؟ تمہیں پتا ہے یہ کون ہے اور اس کے ہمراہ جو لڑکی ہے۔ اس کے بارے میں کیا کچھ معلوم ہے تمہیں۔" عانیہ خود بھی اس کی باتیں سن کر حیران پریشان ہو چکی تھی۔

"مجھے صرف اس کے نام کا پتا ہے اور میں نے زارون کو انسٹی ٹیوٹ آف لندن کے گرین گراؤنڈ میں صرف چند منٹوں کے لیے دیکھا تھا اور اس کے بعد۔" وہ عانیہ کو اپنے دل پر گزرنے والی ہر واردات بتاتی چلی گئی تھی۔ عانیہ نے اس کے خاموش ہونے کے بعد گہری سانس کھینچی اور بولی۔

"چلو شہرے! واپس چلتے ہیں۔" شہرے اس کے پیچھے بہت خاموشی سے چل پڑی تھی۔ ہاسٹل آکر بھی وہ اسی طرح گم سم بیٹھی رہی۔

"وہ لڑکی عدن فرجمند تھی... میری باس' اس کے ساتھ زارون تھا۔ فرم کے مالک کا بیٹا۔ عدن' زارون کی چچا زاد ہے۔ وہ دونوں کزنز ہیں۔ کلاس فیلوز بھی تھے۔ اب فرم میں بھی ساتھ ساتھ ہیں۔" عانیہ بہت دیر سوچنے کے بعد اسے زارون کے بارے میں بتا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

تین ماہ میں وہ کچھ کچھ راستوں کے بارے میں بھی جان چکی تھی۔

اسی کالونی کے ایک چھوٹے سے اسکول میں وہ ایک ماہ کی جاب کا تجربہ حاصل کرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر ہوسٹل کے کمرے میں بیٹھی بوریت کا راگ الاپ رہی تھی۔

"میں ان دیواروں سے اور پلاسٹر آف پیرس کی چھت سے باتیں کرتے کرتے تھک چکی ہوں۔ تمہیں میرا ذرہ بھر احساس نہیں۔"

"اسی بے مروتی کا میڈل تم نے میرے گلے میں سجانا تھا۔" عانیہ نے بہت ہی غمزدہ شکل بنا کر کہا تھا۔ شہرے کی ہنسی چھوٹ گئی۔ مگر عانیہ کافی سنجیدہ تھی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد عانیہ بولی۔

"شہری! حسنین انکل نے تمہیں کوئی ایڈریس نہیں دیا تھا۔"

"ہاں' میرے پاس نانا کے گھر کا ایڈریس ہے مگر وہ تو پچیس سالہ پرانا ہے۔ کیا پتا وہ لوگ اب اس جگہ کو چھوڑ چکے ہوں۔ پاپا کچھ ایسی ہی بات کر رہے تھے۔ یعنی وہ بھی کچھ پر امید نہیں تھے۔" شہرے نے اداسی سے بتایا تو عانیہ نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"کمال ہے شہری! تم بہت ہی عقلمند ہو۔" عانیہ نے طنزیہ کہا اور مزید بولی۔

"مجھے ذرا ایڈریس دکھاؤ' پھر ذرا چلتے ہیں تمہارے نانا کے گھر کو تلاش کرنے۔"

"ناممکن سی بات لگتی ہے۔" اس نے بیگ کھول کر ایک ڈائری نکالی اور عانیہ کو تھما کر صوفے پر پاؤں لٹکائے بیٹھ گئی۔

"مایوسی کی باتیں تمہارے منہ پر جچتی نہیں۔" عانیہ نے ایڈریس کے صفحے پر نگاہیں جمائیں اور پھر قدرے خوشی کے عالم میں بولی۔

"یہ ڈیفنس کا ایریا ہے اور میں ایک مرتبہ پہلے بھی وہاں جا چکی ہوں۔ چلو اٹھو' ابھی چلتے ہیں۔" عانیہ نے فافٹ برش بالوں میں کیا' اور پھر شہرے کو پیچھے آنے کا کہہ کر چل پڑی۔

وہ دونوں رکشے سے ہی ڈیفنس تک آئی تھیں۔ پورا گھنٹہ پر شکوہ اور شاندار کوٹھیوں کی طرز تعمیر کو سراہتے اور گیٹ کے باہر بیٹھے واچ مین اور بڑی مونچھوں والے "خانوں" کی گھوریوں سے بچ بچا کر وہ دونوں اب تھکے تھکے قدم اٹھاتی فٹ پاتھ پر چل رہی تھیں۔

ایک سو بیس مرتبہ وہ دونوں اسی لائن میں بنی بہت ہی بڑی پانچ جدید طرز کے پورشنز پر مشتمل محل نما کوٹھی کے سامنے سے گزری تھیں مگر نیم پلیٹ پر چمکتے نام کو دیکھ کر مایوس سی آگے بڑھ گئی تھیں۔ بختیار سکندر کا نام اس نیم پلیٹ پر نہیں تھا بلکہ ان کے سب سے چھوٹے پوتے "زین" کا نام لکھا تھا۔

اسی پل وائٹ شیراڈ ان کے قریب زن سے گزری تھی۔ انہوں نے اپنے دھیان میں توجہ نہیں دی تھی ورنہ ضرور ٹھٹکتیں کہ وائٹ شیراڈ ریورس ہو کر ایک مرتبہ پھر بہت آہستہ روی سے ان کے پاس سے گزری تھی اور پھر دائیں طرف مڑ کر سیدھے رخ پر چلی گئی۔

"مجھے لگتا ہے۔ نانا لوگ کہیں اور شفٹ ہو گئے ہیں۔" شہرے نے تھکی تھکی آواز میں کہا تھا اور پھر مین روڈ سے رکشا پکڑ کر ہاسٹل چلی آئیں۔

"تم بیٹھو' میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔" عانیہ پرس میز پر اچھال کر سلیپر اڑستے ہوئے باہر نکل گئی۔

"کیا اس جستجو کا کچھ حاصل بھی ہوگا؟" اس نے آنکھیں دباتے ہوئے تھک کر سوچا اور پھر وقت گزاری کے لیے بک ریک میں سے ایک دو کتابیں نکال کر دیکھنے لگی۔

"چاند کا مسافر۔ اس نے ٹائٹل پر نگاہ جمائی اور پھر بغیر پڑھے ہی اسی طرح بک ریک میں سجا دی۔

"چاند کا مسافر" اس نے زیر لب بڑبڑا کر کہا اور پھر آنکھیں موند کر لیٹ گئی۔ وہ بھی تو چاند کی تمنائی تھی۔ دور دیس سے "چاند" کے حصول کی جستجو لیے ان جانے راستوں پر چل نکلی تھی۔ اس بات سے بے نیاز کہ ہر کوئی بلند بخت نہیں ہوتا کہ ہاتھ سے چاند کو

چھولے۔

اس نے ہتھیلی پر لاتعداد ستاروں کے اکلوتے چاند کو رکھنے کی خواہش میں کتنے ہی پل عبور کرلیے تھے۔

وہ بہاروں کی تلاش میں خزاں کے پھولوں کے خیابان میں آپہنچی تھی۔ دسمبر کے چاند کو دیکھنے کی خواہش میں جون کے سورج کو ہتھیلی پر رکھ لیا تھا۔ اس نے ماتھے پر شبنمی صبح کے جھومر کو سجانا چاہا تھا اور کالی رات پھن پھیلائے پھنکارتی ہوئی آگئی۔ اس نے چندا کے رخسار کو ہاتھ سے چھونے کے شوق میں سورج پر دستک دے ڈالی تھی۔ جلنا تو تھا ہی.... پگھلنا تو تھا ہی، پھر یہ "آنسو" کیسے۔

☼ ☼ ☼

"ضروری تو نہیں ہر موڑ پر وہ "اتفاقاً" ٹکرا جائے۔ مان لو یار زارون! کہ کوئی "بھید" چھپا ہے۔ کوئی راز پوشیدہ ہے۔ مجھے تو یہ الفت اور محبت کی کہانی سے کچھ آگے کی بات لگ رہی ہے۔" مونس نے حیرانی سے آنکھیں پھیلا کر انہیں رکشا میں بیٹھتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"میں خود بھی کچھ مشکوک سا ہو رہا ہوں۔ آخر "معاملہ" کیا ہے۔" زارون نے رکشا کو آگے بڑھتے دیکھ کر گاڑی اسٹارٹ کرلی تھی۔

"وہ گھر تک آپہنچی ہے۔" مونس پرسوچ انداز میں بولا۔

"کیا ہمیں ان کا پیچھا نہیں کرنا چاہیے؟"

"رہنے دو یار!" زارون نے بے زاری سے کہا۔ "ہو سکتا ہے وہ "اتفاقاً" یہاں ہمیں نظر آگئی ہو شاید کسی سے ملنے آئی ہوگی۔"

"میں ان "اتفاقات" کو تسلیم نہیں کرتا۔ میرے ساتھ تو ایسے حسین اتفاق نہیں ہوتے۔ بات کچھ اور ہے۔ تم ذرا اس کے پیچھے گاڑی لگاؤ۔" مونس کے اصرار پر اس نے اسپیڈ بڑھا دی تھی۔ ان دونوں کی نظریں مسلسل رکشا کی بیک سائیڈ پر تھیں۔ تھوڑی دیر بعد رکشا ایک کالونی کی صاف ستھری گلی میں مڑ گیا۔

ایک ہاسٹل کے گیٹ کے اندر وہ دونوں جا چکی تھیں۔

"اب کیا کرنا ہے؟" زارون نے پوچھا۔

"واپس چلو، میں اس ہاسٹل کے متعلق معلومات اکٹھی کرتا ہوں۔" مونس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"چھوڑو یار! خوا مخواہ مشکوک ہو رہے ہو۔ ورکنگ لیڈیز لگتی ہیں۔ ہمیں اس پھڈے میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔" زارون نے لاپروائی سے کہا تھا۔

مونس کو گھر ڈراپ کرنے کے بعد وہ آفس چلا گیا تھا۔

"اسفند انٹر پرائزز" اس کے ڈیڈی اسفندیار کی فرم تھی۔ یہ فرم بہت بڑی اور کئی حصوں پر مشتمل تھی۔ اس کے پاپا صرف بزنس کی فیلڈ میں تھے۔ باقی چاروں چچا عدن کے پاپا سمیت سب حکومتی اعلا عہدوں پر فائز تھے۔ عدن کے پاپا فرجمند جسٹس کے عہدے پر تھے۔ فریدون انکل سرجن تھے اور آرمی میں جرنل کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کے دو بیٹے انس اور مونس تھے۔ فرید بیورو کریٹ تھے ان کی صرف دو بیٹیاں تھیں اور دونوں ہی اس کے بڑے بھائیوں ہارون اور فرزان کی بیویاں تھیں۔ پھر فرہاد چاچو تھے جن کا اکلوتا بیٹا زین اس کا یعنی زارون اسفندیار کا دیوانہ تھا۔

فرم کے چار بڑے حصوں کے سربراہ ہارون، فرزان، عدن اور ایک وہ خود تھا۔ عدن اسی کے آفس میں ہوتی تھی۔ البتہ دوسرے دونوں بھائی اس کے معاملات میں نہیں بولتے تھے۔

پاپا کی وراثت میں سے اسے دو فیکٹریاں حصے میں ملی تھیں۔ ان فیکٹریوں کی اچھی مصنوعات، اس وقت الاسکا، امریکہ، آسٹریا، مناکو اور ڈنمارک جیسے سب سے زیادہ قوت خرید رکھنے والے ممالک کو ایکسپورٹ کی جارہی تھیں۔

اس کا بزنس اپنے بھائیوں سے الگ نہیں تھا مگر وہ اس کے کام سے بہت مطمئن تھے یا پھر یوں کہنا مناسب ہوگا کہ وہ دونوں اسے "چھیڑنے" کی غلطی نہیں کرتے تھے کیونکہ اس کا غصہ پورے خاندان میں مشہور تھا اور اسے اپنے پرسنلز میں کسی کی انٹر فیئرنس پسند نہیں تھی چاہے وہ ذاتی زندگی کا معاملہ ہو

یا پھر بزنس کی ڈسکشن۔ وہ اپنے معاملات، مسائل خود سولو کرتا تھا۔ کسی کی ہیلپ قبول کرنا اس جیسے بندے کے بس کی بات نہیں تھی نہ ہی وہ کسی کی رائے کو اہمیت دیتا تھا۔

اس نے اپنی تمام تر تعلیم امریکہ اور لندن سے حاصل کی تھی۔ مونس، انس اور عدن امریکہ میں بھی اس کے ساتھ تھے۔ اور ان کزنز پلس فرینڈز کی اس کی زندگی میں ایک خاص حیثیت اور مقام تھا۔

اس کے تمام تر اکھڑپن کے باوجود اس کے دوست ابھی تک اس کے ساتھ تھے۔ بلکہ ان کی دوستی کو پورے سرکل اور خاندان بھر میں مثالی دوستی سمجھا جاتا تھا۔ وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے کزنز بہت کھلے دل کے اعلا ظرف قسم کے لوگ تھے۔ چھوٹی موٹی "بے عزتیوں" کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔

ہارون اور فرزان دونوں شادی شدہ تھے۔ اور اپنی اپنی لائف میں سیٹ بہت اچھی زندگی گزار رہے تھے مگر زارون کا ابھی شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس کے دونوں بھائیوں کی خواہش تھی کہ وہ بھی اب شادی کرلے اور اس ضمن میں عدن کی صورت ایک اچھی چوائس سامنے تھی۔ دونوں بھابھیاں ماہا اور فائزہ بھی عدن کو دل سے دیورانی بنانے کی خواہش مند تھیں مگر زارون اس معاملے میں مکمل خاموش تھا۔

اس کے دادا بختیار سکندر نے ان کے بچپن میں ہی سب کے رشتے طے کردیے تھے۔ زارون اور عدن کا نام بھی ایک ساتھ سنا جارہا تھا مگر اس کے متعلق زارون کی کیا مرضی یا خواہش تھی۔ تقریباً سب ہی جاننے کو بے قرار تھے۔ عدن کی ماما روشی آنٹی بھی کئی مرتبہ بہانے بہانے سے ان کی منگنی کا ذکر چھیڑ چکی تھیں مگر ہارون بھی اس معاملے میں اپنی بے بسی کا اظہار کرچکا تھا۔

"فرجمند انکل خود بات کرلیں زارون سے۔ اگر ہم دونوں میں سے کسی نے کچھ کہا تو اسے برا لگے گا۔ آپ خود بھی اس کے مزاج سے واقف ہیں۔" ہارون نے صاف جواب دے دیا تھا۔

آج سے پہلے زارون کی زندگی بہت پرسکون گزر رہی تھی۔ مگر پچھلے چند روز سے کچھ عجیب و غریب واقعات نے اسے "چونکا" دیا تھا۔ اک اجنبی لڑکی کا پی سی کے ہال میں اسے یوں دیوانوں کی طرح تکنا اس جیسے بندے کو بھی ڈسٹرب کرچکا تھا۔ اس کے دل کی کیفیات کچھ مختلف سی تھیں۔ آج سے پہلے زارون نے ایسا کچھ محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ خود بھی اپنی فیلنگز سمجھنے سے قاصر تھا۔ کبھی کسی لڑکی کی وجہ سے اس کی نیند آج تک ڈسٹرب نہیں ہوئی تھی مگر اب چند دنوں سے وہ ٹھیک طرح سے سو نہیں پایا تھا۔ ایک دن مونس نے اس کی چوری پکڑلی تھی اور وہ خود بھی اپنی بدلی بدلی دل کی کیفیت کا حال سنانے لگا۔

عجیب کتابی سا چہرہ تھا اور کسی ہوش مند انسان کو پاگل کردینے والی آنکھیں تھیں۔ کتنی محبت، کس قدر دیوانگی سی چھلک رہی تھی ان آنکھوں میں۔ کیا وہ سحر طراز آنکھیں نظرانداز کی جانے والی تھیں یا ان میں جھانکتی انوکھی سی محبت کی چمک کو بھلایا جاسکتا ہے؟

☼ ☼ ☼

آج اس کی زندگی کا یہ پہلا انٹرویو تھا۔ اور اسے جاب مل جانے کی کافی امید تھی۔ تین دن پہلے اخبار میں "اسفند انٹر پرائزز" کی طرف سے ایک اشتہار دیا گیا تھا۔ یہ اشتہار چونکہ عانیہ کی فرم کی طرف سے تھا اسی لیے وہ بے حد ایکسائٹڈ ہوچکی تھی مگر عانیہ نے خوب مخالفت کی۔

"کوئی ضرورت نہیں سیکریٹری کی جاب کرنے کی ... تمہاری کوالیفکیشن کے حساب سے بہترین جاب بھی مل سکتی ہے۔ تھوڑا اور انتظار کرلو، جوں ہی کوئی اچھی پرکشش جاب کے لیے اشتہار دیا گیا تو پہلے تمہارا ہی نام دوں گی ... آخر چار سالوں سے ایڈورٹائزمنٹ کے شعبے سے منسلک ہوں۔ کمپنی کے کسی بھی حصے کے لیے ملازمین، سیکریٹریز چاہیے ہوں تو ایڈ اور تمام تر کوائف میں ہی کمپوز کرتی ہوں۔ ابھی دو ماہ تک نئے منیجر کی ضرورت ہے کمپنی کو نیوز پیپرز میں

پھر سے ایڈ دیا جائے گا۔ میں تمہارے لیے بات کروں گی۔ تم اس سیکریٹری کی جاب کا خیال دل سے نکال دو۔ بڑی "بدنام" سی سیٹ ہے۔"

"اگر مجھے زارون کی فرم میں ریسپشن کی جاب کی آفر بھی ہوتی تو میں بخوشی قبول کر لیتی اور پھر دیکھو نا فرم بھی اچھی' بہترین ساکھ رکھتی ہے اور مراعات بھی تو کافی ساری دی جا رہی ہیں۔" وہ عانیہ کو کول ڈاؤن کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ عانیہ نے جل کر کہا۔

"مراعات دینا ان کی مجبوری ہے کیونکہ یہ جاب اور اس کا شیڈول بہت ٹف ہے۔ اکثر ورکنگ آورز کے بعد بھی آفس میں ٹھہرنا پڑتا ہے۔ خصوصاً" اس وقت جب کوئی ڈیلی گیشن باہر سے آیا ہوا یا پھر کسی غیر ملکی پارٹی کے ساتھ ڈیلنگ چل رہی ہو۔ اکثر لیٹ نائٹ بزنس میٹنگ کے بعد ڈنر وغیرہ کے چکر میں آدھی رات ہو جاتی ہے۔ دوسری کمپنیوں کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کی غرض سے عشائیے دیے جاتے ہیں جن میں سیکریٹریز کا جانا بھی ضروری ہوتا ہے۔ ایسے ہی تو وہ لوگ اتنی مراعات نہیں دیتے۔"

"یار! میں کر لوں گی۔ تم بس تھوڑی سی سفارش کر دینا۔" شہرے نے لجاجت سے کہا تو عانیہ نے منہ بنا لیا۔

"ہرگز نہیں۔ بالکل بھی سفارش نہیں کروں گی۔" اب وہ جان بوجھ کر اسے تپا رہی تھی۔

"پتا چلے گا اس وقت جب زارون صاحب نے شاندار سی "بے عزتی" کا میڈل پہنایا۔ بڑا ناک چڑھا آدمی ہے۔ حد درجہ اکھڑ اور غصیلا۔ کام کے معاملے میں ذرا لحاظ نہیں کرتا۔ مجال ہے جو دس منٹ بھی لیٹ ہونے کی غلطی سرزد ہو جائے۔ گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ چلتا ہے۔ ویسے اس کا حسیناؤں کے معاملے میں "ریکارڈ" صاف ہے۔ ابھی تک کوئی اسکینڈل منظر عام پر نہیں آیا۔ اس کی پہلی سیکریٹری نے خاصی کوششیں کی تھیں لبھانے کی' زلفوں کے جال میں پھنسانے کی مگر بے چاری کی ساری "محنت" بے کار گئی۔ جناب کا مزاج ساتویں آسمان پر رہتا ہے۔ بڑی اونچی "ناک" والا بندہ ہے۔ معیار سے ایک انچ نیچے نہیں آتا۔"

"ان "خوبیوں" نے تو مجھے اور بھی گھائل کر دیا ہے یار!" شہرے نے ہنسی دبائی اور مزید بولی۔

"ویسے ایک کوشش میں ضرور کروں گی۔ کیا پتا میرا سلیکشن ہو جائے۔" عانیہ نے اثبات میں سر ہلا کر گویا اجازت دے دی تھی۔ جس کے نتیجے میں آج وہ اس شاندار سے وزیٹرز روم میں بیٹھی تمام امیدوار لڑکیوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک فیشن ایبل' طرح دار لڑکی تھی۔ یقیناً" کافی کوالیفائیڈ بھی تھیں۔ ایڈ میں دی جانے والی مراعات کافی پرکشش تھیں جس کی وجہ سے وزیٹرز روم میں رنگ و بو کا سیلاب اتر آیا تھا۔ کونے میں موجود ایک گرے صوفے پر بیٹھی وہ ایک ایک چہرے کو بغور دیکھ رہی تھی۔

آخر کار اس کی باری بھی آ ہی گئی تھی۔ وہ فائل سنبھالتی دھڑکتے دل کے ساتھ ایک شاندار و وسیع و عریض آفس کا ڈور کھول کر اندر داخل ہوئی۔

جوں ہی اس کی نظر زارون پر پڑی اس کا دل خوشگوار انداز میں دھڑک اٹھا تھا۔ وہ جو سوچ رہی تھی کہ پتا نہیں انٹرویو پینل میں ــــ زارون ہو گا بھی یا نہیں۔ مگر اب بڑی سی گلاس ٹیبل کے پیچھے چیئرز پر بیٹھے چار آدمیوں میں سے ایک پر زارون کو بیٹھا دیکھ کر وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی۔ وہ صرف کمرے میں موجود تھا۔ انٹرویو لینے والے افراد یا امیدواروں کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ بلکہ دائیں طرف ترتیب سے رکھے کمپیوٹرز میں سے ایک پر' وہ کام کرنے میں مصروف تھا۔

"تشریف رکھیے۔" ادھیڑ عمر فاروقی صاحب نے بغور اس کا جائزہ لے کر کرسی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ شہرے جو ایک ٹک زارون کو دیکھ رہی تھی گڑبڑا کر جلدی سے بیٹھ گئی۔

"پلیز' فائل دکھائیں۔" شہرے نے قدرے اعتماد کے ساتھ فائل سامنے موجود ذرا کم عمر آدمی کی طرف

بڑھا دی۔

"آپ کا نام؟" انٹرویو کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور پہلے سوال کے جواب پر ہی اس نے سامنے موجود افراد کو "چونکا" دیا تھا۔ اپنے خیال میں شہرے نے کوئی انوکھی بات نہیں کی تھی مگر انہیں حد درجہ حیران ہوتے دیکھ کر وہ کچھ پریشان ہو گئی تھی۔ دوسری مرتبہ جب انہی صاحب نے اس کا نام دوبارہ پوچھا تو اس نے بڑے سادہ سے انداز میں کہا۔

"فائل میں لکھا ہے۔ دیکھ لیں پلیز۔" زارون بھی ایک دم چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ وہ بھی شاید کسی ایسے جواب کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ مگر اس کے "چونکنے" کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ اس نے بے ساختہ ہاتھ بڑھا کر فاروقی صاحب کے سامنے رکھی فائل اٹھا کر اپنی طرف کھسکا لی۔

"تو تم اب یہاں بھی پہنچ گئی ہو۔" زارون نے دل ہی دل میں سوچا تھا اور پھر بہت سنجیدگی سے بولا۔

"اپنا نام بتایئے؟" اس کے انداز اور لہجے میں موجود سختی محسوس کر کے شہرے آہستگی سے بولی۔

"شہرے حسنین احمد۔ لوگ مجھے "شہری" کے نام سے زیادہ جانتے ہیں۔" اس کے سادہ سے لہجے میں بہت معصومیت تھی۔ بہت ہی شستہ اور رواں انگلش میں جواب دیا گیا۔ سوائے زارون کے تینوں افراد کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔

"کون سی شہری؟" فاروقی صاحب کی بجائے ایک دوسرے ذرا کم عمر کے آدمی نے دلچسپی سے پوچھا۔

"صباح کی شہری۔ اپنے پاپا کی۔" اس نے ایکدم ہی زبان دانتوں تلے دبا لی۔ اور خود کو دل ہی دل میں ڈپٹا۔

"میں کیا اول فول بکنے لگی ہوں۔" اس کی گھبراہٹ سامنے موجود زارون کو با آسانی نظر آ رہی تھی۔

"آپ یہ جاب کیوں کرنا چاہتی ہیں؟" کافی دیر سوچنے کے بعد زارون نے بہت چبھتے لہجے میں پوچھا تھا۔ یعنی وہ اسے مشکوک سمجھ رہا تھا جو کہ اسلام آباد سے اس کا پیچھا کرتی یہاں آ گئی تھی۔

"میں بہت ضرورت مند ہوں۔" شہرے نے عانیہ کا خوب رٹایا ہوا جملہ بول دیا تھا۔ مقابل طنزیہ انداز میں مسکرایا اور بولا۔

"آپ کی اسکولنگ نیشنل گرائمر اسکول سے ہوئی ہے.... یہ اسکول ملائشیا کے بہترین اسکولز میں شمار ہوتا ہے۔ آپ نے اے لیول لندن سے کیا ہے۔ اس کے بعد بی بی اے اور ایم بی اے بھی انسٹی ٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن لندن سے کیا ہے۔ بہت خوب' اکیڈمک ریکارڈ شاندار ہے آپ کا۔ ان سرٹیفکیٹ میں جو کچھ لکھا ہے وہ ہی آپ کو بتا رہا ہوں۔ آپ اتنا حیران کیوں ہو رہی ہیں۔ کیا یہ آپ کے سرٹیفکیٹ نہیں ہیں؟"

"یس سر! یہ میری اسناد ہیں۔" اس نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"پھر آپ ضرورت مند کہاں سے ہوئیں۔ کیا ایک عام انسان اتنی مہنگی تعلیم افورڈ کر سکتا ہے؟" زارون نے کچھ سخت انداز میں کہا تھا۔ وہ کافی دیر مناسب الفاظ سوچتی رہی تھی۔ اب اسے پورا یقین ہو چکا تھا کہ یہ جاب کم از کم اسے نہیں مل سکتی۔ مقابل بیٹھا شخص بال کی کھال اتارنے کے فن سے آشنا تھا۔ وہ اپنی زیرک نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ شہرے کچھ مضبوط اور با اعتماد انداز میں بولی۔

"آپ کیسے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ میں ضرورت مند نہیں ہوں۔ انسان کے حالات بدلتے ایک لمحہ بھی نہیں لگتا۔ دو پل میں بہت کچھ بدل سکتا ہے۔ کیا پتا' آج جس سیٹ پر آپ بیٹھے ہیں کل میں یہاں بیٹھی ہوں۔" اس کے لہجے کا اعتماد اور ذہانت نے سامنے بیٹھے افراد کو کافی متاثر کیا تھا۔ وہ یقیناً" اس جواب کی بھی توقع نہیں کر رہے تھے۔ زارون اس کی بے ساختگی اور حاضر جوابی کا قائل ہو گیا تھا۔

"یہاں جاب قابلیت کی بنا پر دی جاتی ہے ضرورت کے تحت نہیں۔"

"آپ کو میری قابلیت پر کوئی شبہ ہے جبکہ میرے

تمام سرٹیفکیٹ آپ کے سامنے ہیں۔" اب وہ بہت سنجیدگی اور فل کانفیڈنس کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

"آپ فارن کوالیفائیڈ ہیں۔ اس سے بہتر جاب بھی آپ کو مل سکتی ہے۔" یہ سوال دائیں طرف بیٹھے تیسرے خاموش آدمی نے کیا تھا۔

"بغیر سفارش کے تو نہیں مل سکتی۔ اور بدقسمتی سے میرے پاس کوئی سفارش نہیں ہے۔" شہرے نے بے حد روکھے انداز میں کہا۔

"آپ کو پتا ہے... سیکریٹری کی جاب بہت ٹف ہے؟"

"میں جانتی ہوں۔" یہ آخری جواب تھا۔ اس کے بعد اسے جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ وہ زارون کے ناقابل فہم تاثرات کو دیکھتے ہوئے باہر آگئی۔

☼ ☼ ☼

اسے اندازہ نہیں تھا کہ شہرے حسنین اس کا پیچھا کرتی آفس تک آجائے گی۔ وہ پہلی نظر میں ہی اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔ اگرچہ سیکریٹری کا انتخاب اسی کے آفس کے لیے ہو رہا تھا مگر وہ انٹرویو پینل کی طرف متوجہ نہیں تھا بلکہ لیپ ٹاپ پر ویڈیو آٹو کے دارالحکومت ویلا کے ایک بڑے سرمایہ دار سے چیٹ میں مصروف تھا۔ اس نے بہت کم عرصے میں دوسری دنیا میں ایک اچھی مارکیٹ بنالی تھی۔ اسی کے تعلقات کی بدولت اس کے دونوں بھائی بہت پرافٹ ایبل بزنس کر رہے تھے۔ شہرے کو اپائنٹ کرلیا گیا تھا۔ اگرچہ یہ فیصلہ فاروقی صاحب کا تھا مگر زارون نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ وہ خود چاہتا تھا کہ شہرے اس کے آفس میں کام کرے تاکہ اسے قریب سے جاننے کا موقع مل سکے۔ ابھی تک تو کوئی قابل اعتراض بات اس کی گرفت میں نہیں آسکی تھی اور زارون یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوگیا تھا کہ شہرے قطعاً" بے ضرر ہے۔ وہ ایک محنتی اور ذہین لڑکی تھی۔ ٹائم پر آفس پہنچتی تھی۔ اس نے بہت جلد آفس میں پرومینٹ مقام بنالیا تھا۔ دراصل وہ زارون کو اعتراض کرنے کا موقع فراہم کرنا نہیں چاہتی تھی۔

اس دن وہ معمول سے صرف تین منٹ لیٹ ہوگئی تھی۔ وجہ عانیہ کے آفس میں ہمیشہ کی طرح تانک جھانک تھی جس کی وجہ سے اس کی فوراً" ہی طلبی ہوگئی۔ وہ کچھ ڈرتے ڈرتے زارون کے آفس میں داخل ہوئی۔

"صرف دو تین منٹ دیر ہوجانے پر خواہ مخواہ بے عزتی ہوگی۔ اتنا ٹائم تو لفٹ سے آنے جانے میں بھی لگ جاتا ہے۔" اس نے جل بھن کر سوچا تھا اور آہستگی سے بولی۔

"لیس سر!... آپ نے یاد فرمایا ہے؟" زارون نے سامنے رکھی فائل بند کی تھی اور پھر اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ شہرے کو لمحے کے ہزارویں حصے میں محسوس ہوگیا تھا کہ وہ ایک مرتبہ پھر اردو بولنے کے شوق میں کچھ غلط بول گئی ہے۔

"تشریف رکھیے۔" اس نے سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا تو شہرے جھٹ سے بیٹھ گئی۔ دراصل اسے "بے عزتی" کا خوف دہلا رہا تھا۔ عانیہ نے کچھ اس کے غصے کا ایسا نقشہ کھینچا تھا کہ وہ اچھا خاصا گھبرانے لگی تھی۔

"مس شہرے حسنین! آپ آفس میں اچھی طرح سیٹ ہوگئی ہیں؟ کوئی پرابلم تو نہیں؟" مقابل کے لہجے میں شائستگی نمایاں تھی۔ غصے کا نام و نشان نہیں تھا۔ اسی لیے شہرے ایک دم ریلیکس سی ہوگئی۔

"نو سر!"

"آپ پہلے کچھ پریشان تھیں۔ اب ریلیکس نظر آرہی ہیں، وجہ؟" سوالیہ نگاہیں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔ شہرے گڑبڑا سی گئی۔

"نو سر! ایسی تو کوئی بات نہیں۔" اس نے بوکھلا کر وضاحت دی تھی پھر دل ہی دل میں بولی۔

"کتنے چالاک ہیں، سر آپ۔"

"آل رائٹ! مان لیتا ہوں آپ کی بات' حالانکہ چہرے پڑھنا مشکل نہیں۔ اور آپ کا چہرہ تو کھلی کتاب کی مانند ہے۔" باقی کے الفاظ منہ ہی منہ میں بدبدائے

گئے تھے۔ آواز اتنی کم تھی کہ شہرے چاہنے کے باوجود کچھ سن نہیں پائی تھی مگر اتنا ضرور جان گئی تھی کہ اسی کے بارے میں کمنٹس دیے گئے ہیں۔

"کچھ قوانین' اصول اور قواعد کی بات ہوجائے۔ آفس کا ماحول تو آپ دیکھ چکی ہیں۔ بددیانتی' کام چوری اور بے ایمانی مجھے سخت ناپسند ہے۔ کچھ باتیں آپ کو مس عانیہ نے بھی بتادی ہوں گی۔ آپ کی اچھی پرفارمنس (کارکردگی) دیکھ کر کسی اچھی پوسٹ پر پروموٹ کردیا جائے گا۔ آپ سی وی لائیزڈ اور آنرڈ فیملی کا حصہ لگتی ہیں۔ یقیناً" کوئی مجبوری ہی آپ کو اس سیٹ تک کھینچ لائی ہے۔ بہرحال اس وقت میں نے آپ کو اس لیے زحمت دی ہے تاکہ آپ کی کنوینس کے بارے میں بات کرلی جائے۔ جیسا کہ آفس میں اکثر دیر سویر ہوجاتی ہے اسی لیے آفس وین آپ کو پک اینڈ ڈراپ کرے گی۔ کسی بھی پرابلم کی صورت میں آپ کو ہاسٹل پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے۔ اسی سلسلے میں فاروقی صاحب سے میں نے بات کی تھی مگر ان کے جواب نے مجھے ڈبل مائنڈڈ کردیا ہے۔ آپ کی ذاتی کنوینس ہے۔ اٹھارہ لاکھ کی کرولا کو افورڈ کرسکتی ہیں آپ۔ پھر اس معمولی جاب کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟" اس کا لہجہ گہرا کاٹ دار اور بے حد طنزیہ تھا۔ شہرے کو دانتوں پسینہ آگیا۔ ایسی کسی سچویشن کے بارے میں اس نے سوچا ہی کہاں تھا اور نہ کوئی مناسب جواب ڈھونڈ رکھتی تھی۔

"جھوٹ سے مجھے نفرت ہے۔ کسی بھی شعبے میں آپ اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتے جب تک آپ کے اندر سچائی کے جراثیم موجود نہیں ہوں گے۔ آپ ذمہ دار اور ذہین ہیں' میں تسلیم کرتا ہوں۔ آپ محنتی ہیں۔ یہ چیز بھی نظر آرہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نہایت جھوٹی بھی ہیں۔ آپ نے خود کو ضرورت مند کہا تھا۔ یہ غلط بیانی مجھے سخت ناگوار گزری ہے۔ آپ پر آئندہ کام کے حوالے سے کتنا ٹرسٹ کیا جاسکتا ہے؟" زارون کے زہر میں بجھے سخت الفاظ ایک دم ہی اسے غصہ دلا گئے تھے۔ حالانکہ اسے بہت کم غصہ آیا کرتا تھا۔

"سر! یہ جاب مجھے ضرورت کے تحت نہیں' میری کوالیفکیشن دیکھ کر دی گئی ہے۔ ایڈ میں صرف گریجویٹ کی ڈیمانڈ تھی جبکہ میں نے فرنچ ایم بی اے اعزازی نمبروں کے ساتھ کیا ہے۔ میں فارن کوالیفائیڈ ہوں۔ اگر میری جگہ کوئی اور امیدوار ایسی ڈگریز کے ساتھ انٹرویو دے رہی ہوتی تو یقیناً" اس کا سلیکشن بھی ہوجاتا۔ جہاں تک بات گاڑی کی ہے تو یہ میرا پرسنل میٹر ہے۔ میں نے کیوں لی؟ کہاں سے لی؟ اور کس طرح لی۔ میں آپ کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں... ہاں اگر آپ میرے کام کے حوالے سے ذرہ بھر غلطی دیکھیں تو سرزنش رکھنے کا پورا پورا اختیار رکھتے ہیں۔"

"آل رائٹ! میں آپ کے دلائل تسلیم کرلیتا ہوں مگر کچھ اور باتیں بھی مجھے مشکوک کرچکی ہیں۔ کسی اور وقت ان پر تفصیلاً" بات ہوگی۔ ابھی مجھے ایک میٹنگ اٹینڈ کرنے جانا ہے آپ پلیز چل کے گاڑی میں بیٹھیے۔" وہ اسے ہدایات دے کر انٹرکام پر مصروف ہوچکا تھا۔ شہرے جلتی بھنتی باہر آگئی۔ عانیہ کے آفس میں چند منٹ رک کر بڑی بے زاری کے عالم میں اسے بتایا۔

"خواجہ انڈسٹریز والوں کے بزنس سیمینار میں شرکت کرنے جارہی ہوں۔ پتا نہیں یہ لوگ آئے دن اجلاس اور تقریروں سے بور کیوں نہیں ہوتے۔"

"کہا تھا نا یہ جاب تمہارے بس کی بات نہیں۔ باز آجاؤ' ایسے گھٹیا ایڈونچرز سے مگر تم پر تو سیکریٹری بننے کا بھوت سوار تھا۔ اب بھگتو۔" عانیہ کو تو اس کی "خبر" لینے کا موقع ملنا چاہیے تھا۔

"آج پھر میں عانیہ کو لے کر نانا کے گھر کو ڈھونڈنے کی کوشش کروں گی۔ کچھ اور ملے یا نہ ملے مگر اپنی "ماں" کی تربت کو تو دیکھ لوں گی۔ پاپا وہاں دفن ہیں اور ماما یہاں۔ میرا وجود کئی حصوں میں بٹا ہے۔ میں اپنی "ماں" کی قبر کو دیکھنے جاؤں گی۔ اپنی ماں سے ملوں گی۔ انہیں یہ بتاؤں گی کہ میرا وجود آپ کی محبت کے بغیر ادھورا اور نامکمل تھا ممی! اگر پاپا نہ ہوتے تو آپ کی

شہری ”صباح“ کی سڑکوں پر رل جاتی‘ دھول مٹی ہو جاتی۔ کھو جاتی‘ رشتے سہارا ہوتے ہیں۔ ڈھارس ہوتے ہیں۔ سائبان کی طرح ہوتے ہیں۔ کڑی دھوپ میں چھایا ہوتے ہیں۔ عاجف انکل نے پاپا کو تنہا اور بیمار جان کر ہر زک پہنچانا چاہی تھی۔ اگر میرے بھی چچا یا ماموں‘ نانا یا دادا ہوتے تو میری بیک بھی بہت مضبوط ہوتی۔

مجھے کوئی خوف رات بھر جگائے نہ رکھتا‘ پاپا اسی لیے چاہتے تھے ممی! کہ میں آپ کے خاندان والوں کے پاس پہنچ جاؤں۔ پاپا کو بھی یہی خوف تھا کہ کوئی اور عاجف اور نفیسہ مجھے تنہا دیکھ کر تکلیف نہ دیں۔ وہ مجھے ہر اذیت اور غم سے بچانا چاہتے تھے۔ وہ مجھے رشتوں کا تحفظ دینا چاہتے تھے اسی لیے انہوں نے مجھے آپ کے پاکستان بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ میری ماں کا دیس ہے۔ یہ آپ کا وطن ہے ممی! مجھے اس کی فضاؤں سے‘ ہواؤں سے‘ آتے جاتے موسموں سے‘ بہاروں اور خزاؤں سے‘ دھوپ اور چھاؤں سے بھی محبت ہے۔ ممی! آپ کو کیا پتا کہ کالی بھیانک راتوں میں پاپا کی موجودگی کے باوجود مجھے آپ کی ”یاد“ اور لمس کی خوشبو بہت رلاتی تھی۔“ وہ بہت درد کے عالم میں تھکے تھکے قدم اٹھاتی پارکنگ تک آگئی۔ قطار میں کھڑی گاڑیوں میں وائٹ شیراڈ کو ڈھونڈنا مشکل نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی بلیک کرولا کھڑی تھی۔ وہ بیس منٹ سے وہاں کھڑی اب تھکنے لگی تھی اسی لیے گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگا کر زارون کا انتظار کرنے لگی۔

پندرہ منٹ بعد وہ سامنے سے آتا دکھائی دیا تھا۔ اس کے ساتھ عدن بھی تھی۔ نہ جانے کیوں شہرے کی پیشانی پر ایک ناگوار سی سلوٹ جھلک دکھانے لگی۔

”اوہو‘ تو یہ نئی سیکریٹری ہے تمہاری۔“ عدن کا انداز بہت دل جلانے والا تھا۔ ہونٹ سکیڑ کر اس نے اس کا سر تاپا جائزہ لیا تھا۔ شہرے کو وہ سخت بری لگ رہی تھی۔ اس پورے آفس میں عدن کے ترش مزاج کی دھوم تھی۔ جس پر یقیناً اسے بہت فخر تھا۔ عدن فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ رہی تھی۔ زارون ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے سے پہلے اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے بولا۔

”آیئے مس‘ پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔“

”بیٹھ بھی چکو۔“ اسے اپنی جگہ پر جما دیکھ کر عدن نے استہزائیہ کہا تھا۔ دوسرے معنوں میں کہہ رہی تھی گویا کہ اپنی ”اوقات“ کے حساب سے پیچھے بیٹھو۔ بہت ہی مغرور اور خود پسند‘ زارون کی یہ کزن شہرے کو پہلے دن ہی پسند نہیں آئی تھی۔ یہ ان کی تقریباً“ پانچویں سرسری ملاقات تھی جس میں ہمیشہ کی طرح عدن چوٹ کرنے سے باز نہیں آئی تھی۔ اسے طنزیہ مسکراتا دیکھ کر شہرے نے تحمل سے کہا۔

”میں اپنی گاڑی میں آپ کو فالو کرتی آجاؤں گی سر!“ بڑی شاہانہ تمکنت کے ساتھ جواب دے کر وہ اپنی بلیک کرولا کی طرف بڑھ رہی تھی۔ عدن کے چہرے کے یک لخت بدلنے والے تاثرات اسے مزا دے گئے تھے۔

☆ ☆ ☆
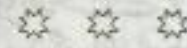
”یہ زارون کی نئی سیکریٹری ہے۔“ مونس کے پوچھنے پر عدن نے اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں دور کھڑی شہرے کو دیکھ کر بتایا۔

”مجھے تو پہلے ہی معاملہ گڑبڑ لگتا تھا اب تو پکا یقین ہو گیا ہے۔ کون سی چیز تمہیں مقناطیس کی طرح کھینچ کر یہاں لائی ہے۔ اس کا جواب تو میں شروع میں ہی جان چکا تھا‘ یہ بڑی مقناطیسی ”شعاع“ لگتی ہے۔ عشق بھی کر سکتے ہیں مگر اسے کسی سیسے یا کنکریٹ کی موٹی دیوار سے روکا نہیں جا سکتا۔ اسے محبت کہتے ہیں‘ بے تحاشا بے حساب محبت۔“

”کہاں گم ہو چکے ہو۔“ عدن نے اسے سوچوں میں گم دیکھ کر حیرانی سے کہا۔

”اس میں کتنی تمکنت اور وقار نظر آتا ہے۔“ مونس اسے سراہ رہا تھا۔ عدن نے ناگواری سے مونس کی طرف دیکھا۔

”ان مڈل کلاس لڑکیوں کے پاس یہی تو ہتھیار ہوتے ہیں مردوں کو رجھانے کے لیے وہ یوں ہی بے نیازی پوز کرتی ہیں۔“

”نہیں‘ یہ شہرے حسین وہ نہیں جو نظر آتی ہے۔“ مونس اب زارون کے ساتھ گفتگو میں مصروف ہو گیا تھا۔

ڈنر کے فوراً“ بعد شہرے نے زارون سے اجازت لینی چاہی تھی۔ اس نے مونس سے کہا تھا کہ وہ شہرے کو ہاسٹل چھوڑ آئے۔ مونس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ شہرے اپنی گاڑی میں اسے فالو کرتی ”جنت حوا“ پہنچ چکی تھی۔ مونس گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ اسی پل ”جنت حوا“ کا گیٹ کھلا اور عانیہ تیزی کے ساتھ اس کی طرف بڑھی۔

”منع کیا تھا میں نے اس منحوس سیکریٹری کی جاب سے۔ رات کے نو بج رہے ہیں۔ میری روح تک کانپ رہی تھی۔ شہری! تم کراچی میں ہی نہیں اس ملک میں بھی نئی ہو راستوں کا تمہیں پتا نہیں۔ حالات اتنے خراب ہیں مگر تمہیں ایڈونچر کی پڑی ہے۔ بس کل سے تم ریزائن کرو۔ تمہیں بھلا جاب کی ضرورت ہی کیا ہے۔ زارون اگر تمہارا۔“ تیز تیز بولتے ہوئے وہ مونس کو دیکھ کر ایک دم لب بھینچ کر خاموش ہو گئی تھی اور شہرے بھی قدرے خجل سی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”میں نے آپ کو بحفاظت پہنچا دیا ہے۔ اب اجازت دیں۔“ مونس بہت گہری نظروں سے اسے دیکھتا واپس پلٹ گیا تھا۔ وہ اپنے پورشن کی طرف جانے کی بجائے سیدھا زارون کی طرف آگیا۔ لاؤنج میں فائزہ بھابھی بیٹھی تھیں۔ مونس انہیں دیکھ کر مروتاً“ کچھ دیر کے لیے کھڑا ہو کر حال احوال پوچھنے لگا۔

”مونس! ذرا میرے پاس بیٹھو میں نے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔“

”کون سی بات؟“ مونس ٹھٹک گیا تھا۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ بات زارون کے متعلق ہے۔

”اکھوجولی! آج فرحمند انکل آئے ہوئے تھے۔ وہ عدن اور زارون کے رشتے کی بات کر رہے تھے۔ نہ جانے زارون مزید کیوں ڈیلے کر رہا ہے۔ اب تو فارن کے آفس کو بھی اسٹیبلش کر چکا ہے وہ۔ مزید اس معاملے کو لٹکانا بہتر نہیں۔ نجانے زارون کے دل میں کیا ہے۔“ فائزہ پریشانی کے عالم میں زارون کے بیڈ روم کے بند دروازے کو دیکھ کر کہہ رہی تھیں۔

”اس کے دل میں کم از کم عدن نہیں ہے۔“ مونس نے سوچا تھا اور پھر فائزہ کو تسلی دے کر زارون کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ زارون کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر بے ساختہ بولا۔

”شہرے کو ڈراپ کر آئے ہو۔“

”یس سر!“ وہ کشن پہ سر رکھ کر کارپٹ پر نیم دراز ہو گیا اور پھر سہولت سے اس کے چہرے کا تفصیلی معائنہ کر کے بولا۔

”فائزہ بھابھی تمہاری اور عدن کے رشتے کی بات کر رہی تھیں۔ انکل بھی شاید آج اسی سلسلے میں آئے تھے۔“

”نہیں کس نے اتھارٹی دی ہے کہ وہ میرے ذاتی معاملات میں بولیں۔“ اس نے کمپیوٹر آف کر کے مونس کی طرف رخ کر لیا۔

”بڑی بھابھی ہیں۔ تمہاری بھلائی کا ہی تو سوچ رہی ہیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو کیا حرج ہے۔ تم اور عدن بنے ہی ایک دوسرے کے لیے ہو۔ اتنی انڈر اسٹینڈنگ ہے تم دونوں کے درمیان۔ پھر عدن کو ریجیکٹ کرنے کی کوئی وجہ بھی تو ہو۔ وہ ہر لحاظ سے بہتر ہے تمہارے لیے۔ آخر بچپن کا ساتھ ہے۔“ مونس نجانے کیا اگلوانا چاہ رہا تھا۔

”میری اور عدن کی دوستی کچھ انوکھی نہیں۔ ہم سب بچپن سے ساتھ ہیں۔ انس‘ زین‘ تم اور روا۔ میں نے کبھی دوستی کے علاوہ کسی اور رشتے کے متعلق نہیں سوچا۔“ زارون نے رکھائی سے کہا۔

”میں چاہتا ہوں کہ ہم سب ہمیشہ اچھے دوست ہی رہیں۔“ وہ صوفے پر لیٹ کر بالوں میں انگلیاں چلانے لگا تھا۔ مونس بہت دیر تک اسے دیکھتا رہا۔

"تم ابھی تک اس بات کو بھولے نہیں ہو؟ روشی آنٹی نے تم سے معذرت بھی کرلی تھی۔"

"ان کی معذرت سے کیا ہوا تھا۔ کیا ماما اور فائزہ بھابھی طنز کرنا چھوڑ چکی تھیں یا پھر پاپا کو واپس لایا جاسکتا ہے۔ عدن کا اس قصے میں کوئی قصور نہیں تھا۔ سو میں اسے معاف کرچکا ہوں۔ مگر روشی آنٹی کے بہتان، الزام تراشیوں اور زہر میں بجھے الفاظ میں آخری سانس تک یاد رکھوں گا۔ پاپا کی وہ نظریں جن میں نہ جانے کتنے ہی شکوے تھے۔ میں کچھ نہیں بھلا سکتا۔ پھر ان نئے رشتوں کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ روشی آنٹی، عدن کی ماں ہیں۔ اس حوالے سے مجھے ان سے ملنا بھی پڑے گا۔ بولنا بھی پڑے گا اور سب سے بڑھ کر وہ عزت اور احترام کہاں سے لاؤں جو وہ خود اپنے ہاتھوں سے کھو چکی ہیں۔" وہ زہر خند ہو رہا تھا۔ مونس کو بھی پانچ سال پہلے کے کچھ واقعات یاد آنے لگے۔

یہی گھر تھا۔ اسی گھر میں آنٹی نے ایسا تماشا لگایا تھا کہ وہ سب ہی کئی دن تک ایک دوسرے سے نگاہ چراتے رہے تھے جبکہ زارون تو پاپا کی ڈیتھ کے بعد لندن چلا گیا تھا۔ ابھی دو سال پہلے اس کی واپسی ہوئی تھی۔

آج سے پانچ سال پہلے جب وہ امریکہ سے کراچی آئے تو ان کی کامیاب واپسی پر اسفندیار نے بہت بڑی پارٹی کا انتظام کیا تھا۔ ان کے دو بھتیجے اور دو بھتیجیاں اور سب سے لائق فائق چھوٹا بیٹا زارون فارن سے اعلا تعلیم حاصل کرکے آئے تھے۔

یہ اس سے اگلے دن کی بات تھی۔ ان دنوں عدن کا ایک کزن ڈنمارک سے آیا ہوا تھا اور آنٹی اس پر بہت فدا ہو رہی تھیں۔ اسی ضمن میں انہوں نے زارون اور عدن کی بچپن کی منگنی توڑنے کا فیصلہ بھی کرلیا تھا مگر اس سے پہلے انہوں نے بڑی پلاننگ کے ساتھ اپنے شوہر اور جیٹھ کو زارون سے متنفر کیا۔

انہوں نے ایک گھریلو ملازمہ کو کافی رقم دے کر اس منصوبے کو کامیاب بنانے کے لیے تیار کرلیا تھا۔ سو ان کی خواہش کے عین مطابق وہ رانی نامی لڑکی روتی دھوتی، چیختی چلاتی، اسٹڈی روم سے برآمد ہوئی اور اس نے چیخ چیخ کر زارون پر بہتان لگانے شروع کردیئے تھے۔ آنٹی کی آواز بھی اس آواز میں شامل ہوگئی۔ انہوں نے ایسے ایسے گھٹیا اور شرمناک الزام لگائے تھے کہ زارون حق دق رہ گیا۔ باقی کسر اس کی بھابھیوں اور بھائیوں نے پوری کردی تھی۔ وہ جو ہر موڑ پر چاہا گیا تھا سراہا گیا تھا۔ اتنی محبتوں اور چاہتوں کے بعد سب کی بدلی بدلی نگاہوں سے ٹوٹ پھوٹ گیا۔ اس شدید صدمے سے اسفندیار کو ہارٹ اٹیک ہوگیا تھا جو کہ جان لیوا ثابت ہوا۔ اپنے بیٹے کی اس قدر توہین اور بے عزتی وہ برداشت نہیں کرسکے تھے۔

پاپا کی اچانک ڈیتھ کے بعد روشی آنٹی کو شدید قسم کے احساس جرم نے گھیر لیا تھا۔ سو ان کی نیندیں ایسی حرام ہوئیں کہ ایک دن دورے کی حالت میں انہوں نے اعتراف جرم کرلیا۔ اور پھر نا صرف وہ شوہر اور بیٹی کی نظروں سے گری تھیں بلکہ خاندان بھر کی لعنت ملامت کا بھی انہیں سامنا کرنا پڑا تھا۔ بھانجے کی طرف سے مایوس ہو کر ایک مرتبہ پھر وہ زارون کی طرف متوجہ ہوگئی تھیں مگر اب زارون نے ایک فیصلہ کرلیا تھا۔ بس وہ مناسب موقع کی تلاش میں تھا کہ کب پورا خاندان ایک جگہ اکٹھا ہو اور وہ روشی کے سر پر بم پھوڑ دے۔

"مونس! کہاں کھو گئے؟ آج کل تم سوچوں میں گم رہنے لگے ہو؟"

"میں بھی تمہارے بارے میں کچھ ایسا ہی سوچ رہا ہوں۔" مونس نے چونک کر فٹ سے جواب دیا۔ زارون مسکرانے لگا تھا۔

"مثلاً کیا....؟" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

"یہی کہ شہرے حسنین تمہارے حواسوں پر سوار ہو رہی ہے۔"

"کبھی کبھی تم ٹھیک اندازے لگا لیتے ہو۔" زارون اب بھی مسکرا رہا تھا۔ مونس ایک دم اچھل کر بیٹھ گیا۔

"میں ہمیشہ تمہارے بارے میں سو فیصد ٹھیک اندازے لگاتا ہوں۔ مجھے تو پہلے دن ہی پوری دال کالی نظر آنے لگی تھی۔ بس تیرے منہ سے اگلوانا تھا۔"

اس نے فخریہ کہا تھا اور پھر زارون کو "جنت حوا" کے گیٹ پر ہونے والی عانیہ اور شہرے کی گفتگو کی تفصیل بتانے لگا۔

"وہ پاکستان کی رہنے والی نہیں ہے۔" مونس نے کہا۔

"ہاں، میں نے اس کے آئی ڈی کارڈ سے معلوم کرلیا تھا کہ وہ ملائشیا کی ریاست صباح سے تعلق رکھتی ہے۔ کئی عرصے سے وہ لوگ ملائشیا میں مقیم ہیں۔ اس کا گھر بہت شاندار ہے۔ فادر کی فوڈ فیکٹری اسے وراثت میں ملی ہے۔ یہ سب جاننے کے باوجود صرف ایک سوالیہ نشان کھٹک رہا ہے کہ وہ پاکستان کس سلسلے میں آئی ہے۔" زارون تفصیلاً بتا رہا تھا جبکہ مونس نے حیرانی سے سر ہلایا اور بولا۔

"مجھے تو پہلے ہی یقین تھا کہ یہ معمولی سی جاب صرف تم سے ملنے کی ایک کڑی ہے۔"

☼ ☼ ☼

"عانیہ! آج یاسر آیا تھا۔" پنڈی سے ثوبیہ آنٹی نے فون کرکے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا تھا۔ عانیہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

"آپ سچ کہہ رہی ہیں امی! بھائی آپ سے ملنے آئے تھے۔"

"ہاں، اور وہ ہمیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔" آنٹی نے آنسو پونچھ کر بڑی محبت سے کہا تو عانیہ بے ساختہ بولی۔

"کہاں....؟"

"ملائشیا۔"

"مگر کیوں؟ کیا بھابھی نے اجازت دے دی ہے۔ آخر ایسی کیا نئی بات ہوئی ہے کہ بھابھی سرتاپا بدل گئیں۔" عانیہ حیران تھی، ششدر تھی۔ اس کایا پلٹ نے اسے گم سم کردیا تھا۔

"وہ بدلنے والی چیز کہاں ہے۔ یاسر نے اسے طلاق دے دی ہے۔" اب کے ان کی آواز پھر سے بھرا گئی تھی۔ انہوں نے ایسا تو کبھی نہیں چاہا تھا۔

"کب...." عانیہ تو پے درپے انکشافات سے دنگ رہ گئی۔

"چند دن پہلے... اور اب وہ ہمیں ساتھ لے جانے پر اصرار کر رہا ہے مگر تمہارے ابو نہیں مان رہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ پہلے تمہاری شادی کردی جائے پھر ہم لوگ یاسر کے ساتھ جائیں گے۔" وہ دل سے بیٹے کو معاف کرچکی تھیں۔ عانیہ فون بند کرکے بھی کتنی ہی دیر ساکت بیٹھی رہی۔

"کیا بات ہے عانیہ!" شہرے ابھی ابھی ایما سے بات کرکے اندر داخل ہوئی تھی۔ اسے گم سم دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"میرا بھائی یاسر لوٹ آیا ہے۔"

"ارے، یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ تم کیوں رنجیدہ ہو۔" شہرے .... خوشی سے بھرپور آواز میں بولی تھی۔

"بھابھی جیسی عورتوں کے انجام پر افسردہ ہوں۔ انہوں نے بھلا کیا پایا ہے سب کے دل دکھا کر۔"

"دفع کرو ایسی بھابھی کو۔ چلو اس خوشی میں تمہیں آئس کریم کھلاتی ہوں۔" شہرے مسکراتے ہوئے بولی۔

"کیا فائدہ تم تو کھاؤ گی نہیں۔"

"تمہیں کھاتا دیکھ کر خوش ہوتی رہوں گی۔" اس نے مزے سے کہا۔

"شہری! کل ہم پنڈی چلیں گے۔" عانیہ کافی دیر سوچنے کے بعد بولی تھی اور پھر انہوں نے جھٹ پٹ پنڈی جانے کا پروگرام بنالیا۔ آفس سے تین دن کی چھٹی لے کر دوسرے دن بائی ایئر وہ دونوں پنڈی پہنچ گئی تھیں۔

اسی شام یاسر ایک مرتبہ پھر بہن سے ملنے ان کے فلیٹ میں آیا تھا اور وہیں شہرے نے یاسر کو بغور دیکھ کر ایک دم ذہن کو دوڑانا شروع کردیا تھا کہ اس نے اس چہرے والے بندے کو کہاں دیکھا ہے۔ اس کی یادداشت چہرے پہچاننے کے معاملے میں بہت اچھی تھی۔ یہ اس کا دعوا تھا۔ اس معاملے میں وہ دھوکا کھا

ہی نہیں سکتی تھی۔
یہ واقعی یاسر تھا۔ مریم کا یاسر۔۔۔ شہرے نے اسے تصویروں کے علاوہ بھی دیکھ رکھا تھا۔۔۔ اس کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔
"آپ یہاں۔۔۔"

✡ ✡ ✡

"تم یاسر بھائی کو جانتی ہو؟" رات کو عانیہ اس سے پوچھ رہی تھی۔ شہرے کے دل میں غم و غصے کے طوفان اٹھ رہے تھے مگر بظاہر وہ پرسکون تھی۔
"بہت اچھی طرح۔" اس نے طنزیہ کہا۔
"مگر کیسے؟" عانیہ اس کا طنز سمجھے بغیر خوش دلی سے بولی تھی۔
"دو دن انتظار کرلو۔۔۔ سارا کچا چٹھا کھول دوں گی۔" شہرے نے سنجیدگی سے کہا تھا اور پھر اس نے اپنا کہا پورا کردکھایا۔
اسی صبح اس نے چپکے سے مریم کو کال ملائی۔ اسے فوراً" پاکستان آنے پر بمشکل راضی کیا تھا۔ اور پھر تین دن بعد وہ ان کے ساتھ فلیٹ میں موجود اپنی داستان سنا رہی تھی۔ اور آنٹی روتے ہوئے مسلسل عائشہ کو چوم رہی تھیں۔ یاسر کو برا بھلا کہہ رہی تھیں۔ خود مریم بھی حیران تھی۔ اسے شہرے سے ایسے سرپرائز کی توقع نہیں تھی۔
انکل نے فوراً" یاسر کو طلب کرلیا تھا اور وہ مریم اور عائشہ کو دیکھ کر گم سم رہ گیا اور پھر اس نے اپنی بیٹی کو بے ساختہ گود میں اٹھایا اور چومنے لگا۔
"میں تم دونوں کو یہاں بلانے والا تھا۔" یاسر نے شرمندگی سے چور آواز میں کہا اور پھر ساری رات صفائیاں پیش کرتا رہا۔
"تم انہیں کبھی معاف نہ کرنا مریم! ایسے لوگ معافی کے قابل نہیں ہوتے۔" شہرے نے سنجیدگی سے کہا۔
"میں خود اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔ جس نے مجھے میری پوتی تک کی خبر نہیں دی۔ تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے یاسر۔" آنٹی بھی مریم کی بھرپور حمایت کررہی تھیں۔ انہیں گویا ہفت اقلیم کی دولت مل چکی تھی۔ وہ اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کرتی کم تھا۔ جس نے ان کی کھوئی ہوئی خوشیاں لوٹادی تھیں اور ادھر یاسر' مریم کے کان میں نجانے کیا کیا سرگوشیاں کررہا تھا۔
اگلی صبح شہرے نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ مریم اور آنٹی کچن میں مصروف حلوہ پوری کا اسپیشل ناشتا بنا رہی تھیں جبکہ عائشہ انکل کی گود میں چڑھی اپنی توتلی باتوں سے انہیں مسلسل ہنسا رہی تھی۔ شہرے اور عانیہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر بے ساختہ مسکرا دی تھیں۔ کیسا فلمی سا سین تھا۔ شہرے' مریم سے ناراض تھی جس نے یاسر کو دو لمحوں میں معافی کا پروانہ تھمادیا تھا۔
"مجھے ایک دفعہ پھر یاسر مل گیا ہے۔۔۔ ایک خاندان مل گیا ہے۔۔۔ میری بیٹی کو اپنی پہچان مل گئی ہے۔۔۔ میں اسی خوشی میں سب کچھ بھلا چکی ہوں شہری جی! مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا کہ میں یاسر کی فیملی کا حصہ بن چکی ہوں۔۔۔ آپ کا بہت شکریہ' یہ سب آپ کی کوششوں کا رزلٹ ہے۔۔۔ میں کبھی بھی اس احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتی۔" مریم نے فرط محبت سے اس کے ہاتھ چوم لیے تھے اور پھر نم آنکھوں سے یہ بتانے لگی تھی کہ یاسر کیوں بغیر کچھ بتائے اپنا اتا پتا دیے غائب ہوا تھا۔
"وہ پہلے یہاں آکر اپنے امی ابو کو منانا چاہتے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ عائشہ کے بعد وہ سنجیدگی سے مجھے اپنے ساتھ واپس لانے کا سوچ چکے تھے مگر پہلے یہاں حالات ٹھیک کرنا چاہتے تھے۔ ان کی پہلی بیوی کی وجہ سے امی' ابو ناراض تھے۔ ان کی بہن بھی خفا تھی۔ وہ سب کو منانے کے بعد مجھے اور عائشہ کو بلوانا چاہتے تھے۔ مگر اس سے پہلے ہی میں یہاں پہنچ گئی اور یہ سب صرف آپ کی مہربانیوں کا نتیجہ ہے۔"
"مگر یاسر بھائی تمہیں اعتماد میں لے کر سب کچھ بتا کر آتے تو بہتر تھا۔ انہوں نے غلطی تو کی ہے۔ میرے نزدیک تو یہ بہت بڑا جرم ہے۔ انہوں نے تمہیں رلایا

ہے' ستایا ہے اور تم احمق انہیں معاف کرچکی ہو۔"
"انہوں نے مجھ سے اس انداز میں معافی مانگی تھی کہ میں انہیں معاف کرنے پر مجبور ہوگئی تھی اور پھر امی اور ابو کی سفارش بھی نظر انداز نہیں کی جانے والی تھی۔ وہ اپنے صبح کے بھولے بیٹے کو پھر سے ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اور پھر شہری جی! میرے لیے اس سے بڑی خوشی کوئی نہیں کہ امی' ابو مجھے قبول کرچکے ہیں۔ مجھے ایک گھر مل گیا ہے۔ میری بیٹی کو اپنوں کا پیار مل گیا ہے۔" حالات کی تلخیوں نے اسے بہت سمجھدار کردیا تھا۔ شہرے دل ہی دل میں قائل ہوچکی تھی۔ واقعی یہ تو بہت خوشی کا مقام تھا کہ آنٹی اور انکل نے مریم کو قبول کرلیا تھا۔ یاسر نے پھر اسے محبتوں کا مان اور سائبان مہیا کرکے پھر سے اس کا دل جیت لیا تھا۔
عورت کا دل تو ہوتا ہی موم کی طرح ہے۔۔۔ ذرا سے پیار کے دو بول پیا کے منہ سے نکلنے کی دیر ہوتی ہے۔ اور عورت بے چاری اپنی جان تک وارنے پر تیار ہوجاتی ہے۔ حوا کی بیٹی جو ہوئی۔۔۔ ایک گھر کی چاہ' ایک مرد کا تحفظ' سارے دکھ بھلا دیتے تھے صرف اسی ایک چاہت نے۔ آبلہ پائی کا سفر بھی بھول چکا تھا۔ رتجگوں کے عذاب' اور راتوں کی تاریکیوں میں بہنے والے آنسو بھی یاد نہیں رہے تھے۔ صرف ایک پیا کی مسکراہٹ نے یہاں سے لے کر وہاں تک پھول ہی پھول کھلا دیے تھے۔ بہاروں نے اپنی آمد کی خبر دے ڈالی تھی۔ بارش کے پہلے قطرے نے دھرتی کے رخسار چوم لیے تھے۔ مریم نے آگے بڑھ کر تمام دریچے کھول دیے۔

✡ ✡ ✡

"میں پوچھ سکتا ہوں مادام آپ سے کہ ہماری والی کو کہاں لے اڑی تھیں آپ۔۔۔ اور ابھی بھی وہ عانیہ بی بی آپ کے ساتھ دکھائی نہیں دے رہیں؟" اپنے پیچھے ایک مردانہ آواز کو سن کر شہرے اچھل کر پلٹی۔
"آپ۔۔۔ یہاں۔" اس نے گھبرا کر پوچھا۔ وہ پچھلے ایک گھنٹے سے ایک مرتبہ پھر اسی لائن میں بنے گھر کی "نیم پلیٹ" پر اپنے نانا کا نام تلاش کررہی تھی جب مونس کی آواز سن کر ٹھٹک گئی۔
"میں بھی یہی سوال آپ سے کرنے والا تھا کہ آپ ادھر کیا کررہی ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے بھی میں نے آپ کو اسی ایریا میں دیکھا اور ابھی میں ٹیرس پر کھڑا کب سے آپ کو ادھر سے ادھر آتا جاتا دیکھ رہا ہوں۔۔۔ اینی پرابلم مس شہرے حسنین!" مونس نے بے حد شائستگی سے پوچھا تھا۔ شہرے نے چند پل میں فیصلہ کرلیا تھا کیوں نہ مونس کی مدد لے جائے۔
"آپ اس ایریے میں رہائش پذیر کسی "بختیار سکندر" کو جانتے ہیں؟" وہ بہت پریشانی کے عالم میں تھکی تھکی آواز میں پوچھ رہی تھی۔ اب کے مونس سچ مچ ٹھٹک گیا۔
"بختیار سکندر سے آپ کیوں ملنا چاہتی ہیں؟"
"یہ بات تو میں انہیں ہی بتاؤں گی۔ کیا آپ مجھے ان کے گھر کا پتا بتا سکتے ہیں۔" شہرے نے بے حد عاجزی سے کہا تھا۔ مونس کچھ پل سوچتا رہا تھا اور پھر آہستگی سے بولا۔
"آپ اس وقت ان کے گھر کے سامنے ہی کھڑی ہیں۔"
"یہ بختیار سکندر صاحب کا گھر ہے۔" شہرے کو اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر نہایت خوشی اور جوش کے ملے جلے انداز میں بولی تھی۔
"آپ ان کے کیا لگتے ہیں۔ یعنی رشتے میں۔" اتنا تو وہ دیکھ چکی تھی کہ مونس اسی گھر کے گیٹ سے برآمد ہوا ہے۔
"میں ان کا پوتا ہوں۔"
"کیا۔۔۔ آپ اسفند ماموں کے بیٹے ہیں۔" شہرے خوشی سے بھرپور آواز میں سرگوشیانہ بولی۔
"نہیں' میرے پاپا کا نام فریدون ہے۔ بڑے پاپا اسفند کا بیٹا زارون ہے۔ آپ زارون کے آفس میں جاب کرتی ہیں نا۔۔۔" مونس بھی اس کے چہرے پر

بکھری خوشی کو دیکھ کر بے حد حیران رہ گیا تھا۔ یہ لڑکی ایک "معمہ" لگتی تھی۔ اب وہ اپنی نم آنکھوں کو پونچھ رہی تھی۔

"آپ مجھے میرے نانا سے ملوا دیں گے۔" شہرے نے ایک تواتر سے بہنے والے آنسوؤں کو ہتھیلیوں سے رگڑتے ہوئے پھر سے بہت التجائیہ انداز میں کہا۔

"نانا..." مونس اچھل ہی تو پڑا تھا۔

"آپ کون ہیں شہرے!" اب کے مونس کے لب ولہجے میں حد درجہ سنجیدگی نمایاں تھی۔

"میں آپ کی پھوپھو یاسمہ بختیار کی بیٹی ہوں۔" شہرے نے بھرائی آواز میں کہا۔ مونس کے سر پر گویا بم بلاسٹ ہوا تھا۔ وہ حق دق سا کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ جو کہ اپنی ہی دھن میں مگن کہہ رہی تھی۔

"میں نے جب پہلی مرتبہ زارون کو لندن میں دیکھا تھا۔ اسی وقت مجھے گویا یقین ہو گیا تھا کہ یہ اسفند ماموں کا بیٹا ہو گا۔ زارون ان سے بہت مشابہ ہے۔ سیم ان کی کاربن کاپی لگتا ہے۔ بس تھوڑا سا فرق ہے ماموں کے چہرے کے نقوش میں نرمی پائی جاتی ہے مگر زارون کے نقوش میں سختی نمایاں ہے۔ یہ دیکھیے اسفند ماموں کی تصویر۔" اس نے بیگ میں سے ایک تصویر نکال کر مونس کے سامنے کر دی تھی۔ اس کی اکلوتی پھوپھو یاسمہ کے ساتھ ایک خوش شکل نوجوان بیٹھا تھا جبکہ بائیں طرف بڑے پاپا اسفندیار پھوپھو کو بانہوں کے حلقے میں لیے بیٹھے تھے۔ مونس کی تمام تر الجھنیں دور ہو گئی تھیں۔ شہرے پی سی کے ہال میں زارون کو دیکھ کر کیوں ٹھٹکی تھی۔ سب روز روشن کی طرح عیاں ہو چکا تھا۔ ایک فطری سی محبت مونس نے اس روتی ہوئی لڑکی کے لیے دل میں محسوس کی تھی۔

"آپ کو تصویر دیکھ کر یقین آ گیا ہے نا کہ میں یاسمہ بختیار کی بیٹی ہوں۔" اس نے بڑے آس بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔ مونس نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اثبات میں سر ہلایا۔

"میں اپنے نانا سے ملنا چاہتی ہوں۔" اس نے بے قراری سے کہا۔

"مگر شہرے! وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ دادو کی بھی ڈیتھ ہو چکی ہے۔ پھوپھو کی وفات کے صرف ایک ہفتے بعد دادو اور پھر دادا بھی انتقال کر گئے تھے۔ اپنی اکلوتی بیٹی کی موت کا صدمہ وہ برداشت نہیں کر سکے تھے۔" مونس اس کے فق چہرے اور کپکپاتے ہونٹوں کو دیکھ کر سر جھکائے بولا۔

"اور اسفند ماموں..." اس کی آواز گویا کنویں سے برآمد ہوئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چکراتے سر کو تھاما۔

"وہ بھی اس دنیا میں نہیں ہیں۔"

"تو پھر شہرے یہاں اس سرزمین پر کیا لینے آئی ہے۔ میرا اعتبار کرنے والے میری ماں کو چاہنے والے تو اس دنیا سے چلے گئے ہیں۔ پھر شہرے حسنین کو کون محبت سے تھامے گا۔ میرے ماتھے پر کون شفقت سے بوسہ دے گا۔ میرا کوئی بھی نہیں رہا۔ میں بالکل تنہا ہو گئی ہوں۔ آس کا دامن بھی چھوٹ گیا۔ میرے پاپا میری ماما۔ میرے سب رشتے ختم ہو گئے ہیں۔ میں شہرے حسنین رشتوں کے معاملے میں کس قدر غریب ہوں قلاش ہوں... مفلس ہوں۔" وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

"ہم ہیں نا... تمہارے اپنے، تم آؤ میرے ساتھ۔" مونس نے آگے بڑھ کر اس کا سر نرمی سے تھپتھپا کر کہا تھا۔ شہرے کے دل کو تھوڑی سی ڈھارس بندھی تھی۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس شیشے کے محل میں اسے سوائے "آنسوؤں" کے کچھ نہیں ملے گا۔

☼ ☼ ☼

"خود کو سنبھالو شہرے! زندگی میں بڑے بڑے طوفانوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں قدم قدم پر کانٹے بچھے ہوئے ہیں۔ بہت پھونک پھونک کر پاؤں رکھنے پڑتے ہیں۔" عائیہ اسے بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے بھرائی آواز میں کہہ رہی تھی۔

مونس اسے اپنے پورشن میں لے جانے کی بجائے عدن کے پورشن میں لے آیا تھا۔ اس کے ممی پاپا چند دن

کینٹ میں عارضی طور پر مقیم تھے۔ وہ آنٹی کو شہرے کے متعلق بتا کر انہیں حیران پریشان چھوڑ کر زارون کو بتانے کے لیے باہر کی طرف بھاگا تھا۔ کچھ خوشی اور شہرے کے متعلق انوکھے سے انکشاف نے ذہن کو باؤنڈ کر دیا تھا ورنہ وہ زارون کو فون پر بھی انفارم کر سکتا تھا۔

"اچھا تو تم یاسمہ کی بیٹی ہو..." روشانہ نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا تھا۔ اسی لڑکی کی وجہ سے رات کو ان کے اور زارون کے درمیان زبردست سی جھڑپ ہوئی تھی۔ وہ ان کی اکلوتی لائق فائق حسین بیٹی پر کسی دو ٹکے کی سیکریٹری کو فوقیت دے رہا تھا۔ کل اس نے ہارون کے بیٹے کی سالگرہ کے فنکشن میں اعلان کر دیا تھا کہ وہ کسی شہرے حسنین سے شادی کا فیصلہ کر چکا ہے۔ عدن کے مقابلے میں وہ کسی سیکریٹری کو سامنے لے آیا تھا۔ روشانہ کو آگ بگولا ہونے میں صرف چند پل لگے تھے۔ غصے اور توہین کے احساس سے ان کا رواں رواں سلگنے لگا تھا۔

"تم جانتے ہو عدن تمہاری منگیتر ہے۔"

"وہ بھی تھی۔ اب نہیں، اس نام نہاد منگنی کو آپ خود توڑ چکی ہیں۔ اتنا پرانا واقعہ تو نہیں۔ نہ ہی آپ کی یادداشت اتنی کمزور ہے۔" زارون نے تمسخرانہ کہا۔

"اب میرے ساتھ کون سے 'لعل' جواہرات جڑ گئے ہیں۔ میں وہ ہی زارون اسفند ہوں جسے پانچ سال پہلے آپ نے انہی سب لوگوں کے درمیان تماشا بنا دیا تھا۔"

"میری بیٹی کو تم ٹھکرا کر اس دو ٹکے کی سیکریٹری کو اس گھر میں لاؤ گے۔" روشانہ نے چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا رکھا تھا۔ وہ اپنے شوہر کو بھی بے نقط سنا رہی تھیں جو خاموش تماشائی بنے کھڑے تھے۔ عدن الگ توہین کے احساس سے بھری شیرنی بنی غصے کے عالم میں بل کھا رہی تھی۔ زارون کے اس فیصلے کو سن کر اس کی دونوں بھابھیوں نے بھی اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ اس کے دونوں بھائی بھی کچھ خاص خوش نظر

نہیں آ رہے تھے۔ سب نے فرداً فرداً اسے سمجھانا چاہا۔

"اس لڑکی کا بیک گراؤنڈ کیا ہے؟ معمولی سی سیکریٹری کے لیے خاندان میں ایک جنگ کے سلسلے کو مت شروع کرو۔ کم از کم اپنے اسٹینڈرڈ کی لڑکی کو عدن کے مقابلے میں لاتا تھا۔ ان مڈل کلاس کی لڑکیوں کو اچھے گھرانوں کے امیر لڑکوں کو پھانسنے کے علاوہ آتا ہی کیا ہے۔" فرزان کا انداز جلا کٹا تھا۔ زارون کا چہرہ غصے کے احساس سے سرخ پڑ گیا۔

"آپ کون ہوتے ہیں اس کی کلاس کا تعین کرنے والے۔ وہ میرے لیے کیا ہے۔ یہ آپ لوگ نہیں جان سکتے۔ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کوئی بزنس ڈیلنگ نہیں۔ اور برائے مہربانی آپ کو میرے معاملات میں مداخلت کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے "پرسنلز" میں اپنے بھائیوں کا بولنا بھی پسند نہیں کرتا۔"

گھر میں اک سرد جنگ کا آغاز ہو چکا تھا... روشانہ بیٹی کے دل کی کیفیت سے واقف تھیں۔ سو انہوں نے ایک دفعہ پھر عدن کی خاطر شوہر سے لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا تھا... زارون پر کوئی اثر ہوتا نہ دیکھ کر انہوں نے ایک مرتبہ پھر اس پر الزام تراشیاں اور بہتان باندھنے شروع کر دیے تھے۔ اور اب شہرے کی آمد تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کا باعث بنی تھی۔ مونس کے انکشاف نے انہیں متوحش کر دیا تھا کہ یہی زارون کی سیکریٹری اور یاسمہ کی بیٹی ہے۔ جس سے وہ شادی کا فیصلہ کر چکا ہے۔ وہ شہرے کو دیکھ کر پاگلوں کی طرح چلانے لگی تھیں۔ اسی اثنا میں عدن بھی آ گئی۔

"تیری ماں بھی بے غیرت تھی۔ تو بھی بے غیرت ہے۔ وہ بھی کسی غیر ملکی پر عاشق ہو کر گھر سے بھاگ گئی تھی۔ اسے بھی مردوں کو لبھانا آتا تھا۔ تو نے بھی یہی گُن وراثت میں لیے ہیں۔ بدکردار ماں کی بدکردار بیٹی۔ ادھر کیا لینے کے لیے آئی ہے۔ دفع ہو جا یہاں سے۔ تیرے ہوتے سوتے مر کھپ گئے ہیں۔ پانچ سال پہلے آتیں تو اسفندیار نے تجھے ضرور چوم چاٹ کر سینے

سے لگالیتا تھا۔ اسے گندگیاں اور غلاظتیں سمیٹنے کی عادت تھی۔ تیری ماں کے ”معاشوقوں“ کی داستان سن کر وہ چلا گیا تھا اسے لے کر نکاح کرنے‘ خود ہاتھ سے پکڑ کر تیرے باپ کے گھر چھوڑ آیا تھا اس بے غیرت کو۔ مری جارہی تھی اس حسنین احمد کے عشق میں۔ نہ باپ کی عزت کا خیال کیا نہ بھائیوں کی غیرت کا۔“ روشانہ کے ساتھ ساتھ اب عدن بھی چلا رہی تھی۔ اس پر کیچڑ اچھال رہی تھی۔ اس کے کردار کی دھجیاں بکھیر رہی تھی۔

”سوائے زارون کے تجھے اس پوری دنیا میں کوئی نہیں ملا۔ آگئی ہو مجھے برباد کرنے‘ آوارہ ماں کی اولاد۔ تجھ جیسی بے شرم‘ بے حیا عورت کو راہ چلتے بہت مل جائیں گے۔ جان چھوڑ دو زارون کی۔“

شہرے کو لگ رہا تھا گویا کسی نے اس کے حلق پر چھری رکھ کر چلادی ہے۔ اپنی ماں کے بارے میں ایسے توہین آمیز الفاظ سن کر اس کے اندر بھانبھڑ جلنے لگے تھے۔ کچھ دیر بعد گھر کے اور بھی افراد اکٹھے ہونے لگے تھے۔ ماما‘ فائزہ‘ زین۔۔۔ نوکر‘ مالی‘ ڈرائیور۔ شہرے کو یوں محسوس ہو رہا تھا وہ اک پل میں ہی چکرا کر زمین بوس ہو جائے گی۔ اس نے عدن کے منہ کو نوچ لینا چاہا تھا۔ اس کے چہرے کو مسخ کر دینا چاہا تھا۔ کسی نیزے کو اس کے سینے میں اتار دینا چاہا تھا۔ اس کے پتھر وجود میں حرکت ہوئی تھی اور پھر وہ یکدم پھٹ پڑی۔

”اعلا حسب نسب والی بد زبان عورتو۔۔۔ تم کیا جانو ”محبت“ کس شے کا نام ہے۔ میری ماں کی عظمت کا تم لوگوں کو کیا پتا۔ کیا خبر میری ماں کو چاہنے والے منوں مٹی تلے جا سوئے ہیں۔ پہلے اپنے گریبان میں جھانک لو‘ پھر کسی دوسرے پر تہمت لگانا۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے پاپا کا فیصلہ غلط تھا۔ انہوں نے مجھے غلط جگہ پر بھیجنے کا فیصلہ کر کے مجھے میری ہی نظر سے گرا دیا ہے۔ وہ جانتے نہیں تھے۔ تم لوگ انسان نہیں ہو‘ نہ تم میں انسانیت پائی جاتی ہے۔ تم لوگ ناسور ہو۔ عذاب ہو‘ آج میں اپنی ممی کے بھائیوں کے گھر سے ذلتوں کے ”تحفے“ لے کر جا رہی ہوں۔ حقارت اور نفرت کی سوغات ملی ہے مجھے۔۔۔ یہ میری ماں کا پاکستان ہے۔ اس وطن سے مجھے اتنی محبت ہے‘ اتنی الفت ہے صرف اس لیے کہ میری ماں کا پاکیزہ وجود اس پاک زمین کی گود میں محفوظ ہے۔ یہاں میرا سب سے بڑا اثاثہ میری ماں کی ”قبر“ ہے۔ میں کسی کلرک کی بیٹی نہیں ہوں۔ جو آپ کے اعلا خاندان اور اپر کلاس کا حصہ بننے کے لیے کسی غیر مرد کو لبھاؤں گی۔

میرا ”ہوم لینڈ“ تمہارے ان پانچ پورشنز پر مشتمل گھر سے بھی بڑا ہے۔ میرے پاپا کی فوڈ فیکٹری آپ کی تمام فیکٹریوں سے زیادہ پرافٹ دیتی ہے۔ میرے پاپا نے مجھے سب کچھ بتایا تھا کہ پاکستان میں میری ممی کے پانچ بھائی رہتے ہیں۔ ان کے ممی پاپا ہیں۔ ان کا بہت اعلا حسب نسب ہے۔ انہوں نے مجھے سب کچھ بتایا تھا صرف یہ بتانا بھول گئے تھے کہ ممی کے بھائیوں نے رشتوں کو دولت کے ترازو میں رکھا ہوا ہے۔ جنہیں انسانیت اور محبت کے کسی سبق کا پتا نہیں۔ جو ان کی ”شہری“ کو کسی مردار کی طرح دھتکار دیں گے۔ جو مجھ پر اتنا کیچڑ اچھالیں گے کہ میرا پورا وجود اس گندگی سے لت پت ہو جائے گا۔“ اس نے آخری حقارت بھری نگاہ ان کی ساکت‘ مہر بہ لب چہروں پر ڈالی تھی اور ”آنکھ“ میں ڈھیروں آنسو لیے نکلتی چلی گئی۔

اس نے اپنے پیچھے ایک آواز سنی تھی۔ یہ فرحمند سکندر کی آواز تھی۔

”شہرے بیٹا! رک جاؤ۔“ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ مڑ کر دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ یہ اس کی ماں کے خاندان والے تھے۔ ان اپنوں کی چاہ میں وہ اپنی ہستی کا غرور تک کھو بیٹھی تھی۔ وہ ان سے ملنے کی ہمک لیے اتنی دور سے یہاں تک آئی تھی۔ وہ رشتوں کا مان اور تحفظ لینے کے لیے آئی تھی یہ نہیں جانتی تھی کہ اپنی انا اور تمام تر تفاخر گنوا بیٹھے گی۔ اس کے آنسو عانیہ کے دل پر گر رہے تھے۔ وہ اسے سمیٹتے سمیٹتے خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ ہتھیلی پر جلتا چراغ رکھ لیا تھا اس نے جلن تو ہونا ہی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ زارون اسفند تھا۔ اپنے پاپا کا سب سے چھوٹا اور لاڈلا بیٹا۔ اس کی پیدائش کے چار سال بعد ماما کی ڈیتھ ہوگئی تھی۔ ماما کے بعد پاپا نے دوسری شادی نہیں کی۔ وہ شروع سے ہی اپنے پاپا کے ساتھ بہت اٹیچ تھا۔ وہ بھی اپنے بڑے دونوں بیٹوں کی نسبت اس سے زیادہ محبت کرتے تھے۔ اس لیے بھی کہ وہ سب سے چھوٹا تھا اور شاید اس لیے بھی کہ وہ ہو بہو شکل و صورت میں ان جیسا تھا البتہ اس کا مزاج اپنے پاپا جیسا تھا نہ ماما جیسا۔ وہ بے حد غصیلا اور اکھڑ مزاج تھا بالکل اپنے دادا جیسا۔

بختیار سکندر کو اپنی ساری اولاد میں سب سے زیادہ اپنی چھوٹی بیٹی یاسمہ سے محبت تھی۔ وہ اپنے بھائیوں اور ممی کی بھی بہت لاڈلی تھی مگر سب سے بڑے بھیا اسفندیار سے اس کی دوستی اور محبت مثالی تھی۔ وہ اپنی ہر چھوٹی سے چھوٹی بات ہر مسئلہ اپنے بھیا اسفندیار سے شیئر کرتی تھی۔ اور پھر یاسمہ نے اپنی زندگی کے بہت اہم معاملے کو اپنے بھیا سے نہ چھپا کر انہیں اور بھی خود سے قریب کر لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی لاڈلی بہن کی خاطر اپنے والد سے الجھ پڑے تھے۔ پاپا کو قائل کرنا انتہائی مشکل امر تھا۔ وہ ایک دفعہ فیصلہ کرتے تھے اور پھر ہمیشہ کی طرح اس پر ڈٹ جاتے۔ دنیا کی کوئی طاقت انہیں فیصلہ بدلنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔ انہوں نے اپنی لاڈلی بیٹی کے معاملے میں بھی اپنے اصولوں کو نہیں توڑا تھا۔ سو ایسے حالات دیکھ کر اسفندیار نے ملائشیا جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ حسنین احمد سے ملنا چاہتے تھے۔ اسے پرکھنا چاہتے تھے اور پھر انہیں حسنین احمد کو دیکھ کر مایوسی نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ اپنی بہن کے انتخاب کو سراہے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔

اک طویل جنگ کے بعد جب پاپا کسی طور نہ مانے تو وہ خود یاسمہ کو لے کر ملائشیا چلے گئے تھے۔ ان کی موجودگی میں نکاح کی رسم ادا ہوئی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اس انتہائی اقدام کی وجہ سے انہیں پاپا سمیت سب کی ناراضی برداشت کرنا پڑے گی۔ مگر پاکستان آنے

کے فوراً بعد انہیں پاپا کی طرف سے جلاوطنی کا حکم مل گیا تھا۔ وہ ان کی کسی دلیل کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ سو وہ اپنی بیوی حاجرہ اور بچوں سمیت لندن چلے گئے۔ حاجرہ کی ڈیتھ اور باسمہ کی اچانک موت کی خبر نے انہیں کئی سالوں تک اک نہ ختم ہونے والی اذیت میں جکڑے رکھا تھا مگر پھر آہستہ آہستہ وہ اپنے بچوں کی طرف متوجہ ہو گئے تھے مگر باسمہ کو بھلانا ان کے بس کی بات نہیں تھی وہ بھی اس صورت میں جب امی، پاپا انہیں ہی الزام دیتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی بھی انہیں مجرم تصور کرتے تھے جنہوں نے ان کی پیاری بہن کو ان سے دور کر دیا تھا۔ پاپا کے خیال میں ان کا فیصلہ غلط تھا اور حسنین احمد کو وہ باسمہ کے ایکسیڈنٹ کا ذمہ دار ٹھہراتے تھے۔

زارون نے ہوش سنبھالنے کے ساتھ اپنے باپ کو کمرے میں بند چھپکے چھپکے روتا دیکھا تھا۔ وہ اکثر ہی نجانے کس کی تصویر کو دیکھ کر پہروں روتے رہتے تھے۔ وہ پہلے سے زیادہ خاموش رہنے لگے تھے۔ بہت عرصہ تک زارون نے بھی اس تصویر والی ہستی کے متعلق پوچھنے کی زحمت نہیں کی تھی مگر پھر ایک دن اس نے پاپا سے پوچھ ہی لیا۔

"یہ باسمہ ہے میری چھوٹی بہن، تمہاری پھوپھو۔" پاپا کی آنکھیں پرنم تھیں۔ ان کی آواز بھرا رہی تھی۔

"پاپا! آپ کیوں رو رہے ہیں؟ کیا ان کی ڈیتھ ہو چکی ہے؟" زارون کے پوچھنے پر انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ زارون بہت دیر تک اپنی پھوپھو کی تصویر کو دیکھتا رہا۔ بہت خوبصورت کتابی چہرہ تھا۔ زارون نے اس تصویر کو پاپا کی بیڈ سائیڈ ٹیبل پر اتنی مرتبہ دیکھا تھا کہ باسمہ کے چہرے کا ایک ایک نقش اسے ازبر ہو چکا تھا۔ وہ آنکھیں بند کرتا تو چھم سے ایک ہنستی مسکراتی تصویر سامنے آجاتی تھی پھر یہ کیسے ناممکن تھا کہ وہ شہرے حسنین احمد کو پہچاننے میں غلطی کرتا۔ اسے پاپا نے پھوپھو کے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا۔

"تو آپ کو کم از کم پھوپھو کی بیٹی سے رابطہ رکھنا چاہیے تھا پاپا!"

"حسنین گھر بیچ کر کہیں اور شفٹ ہو چکا ہے۔" پاپا نے رنجیدگی سے بتایا تھا۔ اور پھر جب وہ پڑھنے کے لیے امریکہ جا رہا تھا تو پاپا نے اس سے انوکھی سی بات کی تھی۔

"تم شہرے کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنا زارون! چھٹیوں میں ملائشیا کا ایک چکر ضرور لگا لینا۔ کیا پتا شہرے کا کہیں سے سراغ مل جائے۔"

اس نے پاپا کا دل رکھنے کے لیے ہامی بھرلی تھی مگر پھر امریکہ جا کر سب کچھ بھول بھال گیا۔ ملائشیا کوئی چھوٹا سا ملک ہے۔ وہ کہاں شہرے کو ڈھونڈتا پھرتا۔ اسے پاپا کی فرمائش پر ہنسی آرہی تھی۔

پھر وقت گزرتا رہا۔ وہ، مونس، انس، ردا اور عدن اپنی تعلیم مکمل کر کے پاکستان لوٹ آئے تھے۔

عدن فرجند! اس کی دوست تھی۔ کزن تھی اور منگیتر بھی۔ پاپا کا ارادہ اس کی شادی کر دینے کا تھا مگر نہ جانے کیوں روشی آنٹی ٹال مٹول سے کام لے رہی تھیں۔ ان کی گھٹیا سازش کا عقدہ بھی جلد ہی کھل گیا۔ وہ عدن کی شادی اپنے بھانجے سے کرنا چاہتی تھیں۔ اور اس رشتے کو توڑنے کے لیے انہوں نے بڑی جاندار پلاننگ کر رکھی تھی۔ ان کا ڈرامہ کامیاب رہا تھا مگر پھر روشی آنٹی کے خواب توڑ کر ان کا اکلوتا لاڈلا بھانجا واپس ڈنمارک چلا گیا تھا۔ آنٹی کی گھٹیا سازش کی لپیٹ میں صرف وہ نہیں آیا تھا بلکہ انہوں نے اس کی پھوپھو باسمہ کی کردہ ناکردہ غلطیوں کو بھی دہرانا شروع کر دیا تھا۔ پاپا یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکے تھے۔

ان کی وفات کے بعد زارون نے اپنے اندر بہت سی تبدیلیاں محسوس کی تھیں۔ اس کے بھائیوں جیسے کزنز کا ساتھ نہ ہوتا تو یقیناً اس کے دماغ کی شریان ضرور پھٹ جاتی تھی۔ اسے آنٹی سے شدید قسم کی نفرت ہو چکی تھی۔ مگر عدن سے وہ بے رخی نہیں برت سکا تھا۔ اسی لیے وہ ابھی تک ساتھ ساتھ تھے۔ پھر انہی دنوں اسے لندن جانا پڑا تھا۔ اسے کاروباری حوالے سے کچھ لوگوں سے ملنا ملانا تھا۔ آفس ورک کے علاوہ واپس آنے سے پہلے وہ اپنے ایک عزیز ٹیچر سے ملنے

یونی ورسٹی چلا گیا تھا۔ دو گھنٹوں کی طویل ملاقات اور گپ شپ کے بعد جب زارون واپس جانے کے لیے گراؤنڈ سے گزرتا ہوا بیرونی گیٹ تک جا رہا تھا تو اسے یوں محسوس ہوا کہ کوئی بہت پرشوق نگاہوں سے اسے دیکھ رہا ہے۔ ان نظروں کی تپش نے اسے مڑنے پر مجبور کیا تھا مگر اردگرد اسے کوئی ایسا شناسا چہرہ دکھائی نہیں دیا تھا۔ اسی لیے وہ دوبارہ سے اپنی دھن میں مگن گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

دوسری مرتبہ اسی قسم کے احساسات سے دوچار وہ ایک شاپنگ مال سے گزرتے ہوئے ہوا تھا۔ اس دفعہ بھی کوئی چہرہ اس کی نگاہ کی زد میں نہیں آیا تھا جسے دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رک جاتا۔ مگر پارکنگ تک جاتے جاتے اس نے مڑ کر ایک دفعہ پھر دیکھا تھا۔ ایک لڑکی تقریباً" بھاگتے ہوئے سامنے سے آرہی تھی۔ زارون نے کوئی توجہ نہیں دی تھی اور پھر گاڑی میں بیٹھ کر وہ واپس اپنے فلیٹ کی طرف آگیا۔

تیسری مرتبہ وہ جان چکا تھا کہ لندن میں قیام کے دنوں میں وہ کیوں ایسے احساسات کا شکار رہا ہے۔ پی سی کے ہال میں موجود وہ لڑکی جس شوق کے عالم میں محبتوں کا جہاں آنکھوں میں سموئے اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ اب کے زارون کے ٹھٹکنے کی وجہ وہی کتابی چہرہ تھا جس کی تصویر اس نے کئی ہزار مرتبہ پاپا کے کمرے میں دیکھ رکھی تھی۔

وہ شہرے حسنین احمد تھی۔ اس کے پاپا کی عزیز از جان بہن کی بیٹی۔ وہ اسے پہچان چکا تھا۔ پھر وہ کئی مرتبہ مختلف جگہوں پر اسے دکھائی دینے لگی۔ مگر حقیقت میں وہ اس وقت "چونکا" تھا جب وہ ایک معمولی سی سیکریٹری کی جاب کے لیے انٹرویو دینے کے لیے آگئی۔ اب تو کوئی راز چھپا نہیں رہا تھا۔ اسے مونس کی تمام تر باتوں میں سچائی نظر آنے لگی تھی۔ زارون اس کی کوالیفکیشن دیکھ کر حیران نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ اسے یاد آچکا تھا کہ اس نے لندن یونیورسٹی میں شہرے حسنین کو ہی دیکھا تھا۔ اس کے آئی ڈی کارڈ پر موجودہ ایڈریس "صباح" کا تھا۔ اس نے اپنے ذرائع استعمال کر کے شہرے کے بارے میں تمام تر معلومات اکٹھی کرلی تھیں۔ وہ حسنین احمد کی بیٹی تھی۔ اس کے باپ کی بہت بڑی فوڈ فیکٹری تھی۔ بہت سے ممالک کو بند ڈبوں میں موجود خشک خوراک اسی فیکٹری سے ایکسپورٹ کی جاتی تھی۔ شہرے کے بارے میں سب کچھ جاننے سے پہلے ہی زارون اسفند کو اس سے پہلی نظر کی محبت ہو گئی تھی۔ پی سی ہال میں وہ ان اٹھتی گرتی پلکوں والی آنکھوں کا دیوانہ ہو گیا۔ اس نے خود سے محبت کا اعتراف کرنے میں دیر نہیں کی تھی مگر اس دیوانی لڑکی کو بتانے میں یقیناً "دیر" کر رہا تھا۔

مونس اسے شہرے کی گھر تک رسائی کے متعلق بتا چکا تھا۔ ان دونوں کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی شہرے چلی گئی تھی اور وہ فرجند انکل کو آنٹی پر اور عدن پر گرجتا، برستا سن کر ٹھٹک گئے۔

"جاؤ۔ زارون، مونس اسے ڈھونڈ کر لاؤ۔ میری باسمہ کی بیٹی کو ڈھونڈ کر لاؤ۔ آج اسفند بھیا زندہ ہوتے تو کس کی جرات تھی کوئی شہرے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھتا۔" زارون نے فرجند انکل کی بھرائی آواز سنی تھی اور پھر انہی قدموں پر پلٹ گیا۔

☼ ☼ ☼

"شہری! یہ دسمبر کی بارش ہے۔ مت بھیگو، بیمار پڑ جاؤ گی اور میرے پہلے سے سڑے ہوئے ہنی مون کا بالکل بیڑہ غرق ہو جائے گا۔" زارون کی دہائیاں جاری ساری تھیں۔ جبھی تین کمروں والے خوبصورت کاٹیج کا اندرونی دروازہ کھول کر مونس جلتا کلستا باہر نکلا۔

"خبیث انسان! اپنے ہنی مون کی اتنی فکر ہے۔ دوسروں کی نیند اور رومانس بھرے ماحول کا چلا چلا کر بیڑہ غرق کر دیتے ہو۔"

"چل، شکل گم کر اپنی۔۔۔ خواہ مخواہ موڈ خراب مت کرو۔ میں پہلے ہی "بھرا" ہوا بیٹھا ہوں۔ کہیں غصے سے پھٹ نہ جاؤں۔" مونس اس کے جلے کٹے انداز کو ملاحظہ کر کے جی بھر کر ہنس رہا تھا۔ کیونکہ وہ ہنی مون منانے کی غرض سے مری آنا ہی نہیں چاہتا تھا مگر شہری

کی ضد کی وجہ سے اسے ہار ماننا پڑی تھی۔ اور یہ کیسے ممکن تھا کہ مونس اسے اکیلے ہنی مون منانے دیتا۔ اس نے بھی ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اپنی ماما کو بذریعہ فون کرکے عانیہ کے گھر بھیجنے کے بعد وہ چین کی بانسری بجا رہا تھا۔ جب زارون دندناتا ہوا اندر آیا۔

"میری شادی کی خوشی برداشت نہیں ہو سکی۔ جھٹ سے سہرا سجانے کے لیے تیار ہو گئے ہو۔ پہلے کیا گہری نیند سو رہے تھے۔"

"زندگی بھر تمام کام اکٹھے ہی کیے ہیں۔ سوچا ہے یہ شادی والا کام بھی ساتھ ہی نبٹا لیں۔ آخر تجھے دولہا بنا دیکھ کر میرا سیروں کے حساب سے خون جلنا تھا۔ اسی لیے میں نے اپنا بھی "بندوبست" ساتھ ہی کر لیا ہے۔ اب ممی کے فون کا انتظار ہے۔ نہ جانے وہ کون سا صور پھونکتی ہیں کانوں میں۔" وہ آنکھ دبا کر شرارت سے بولا۔

"وہ میری چاچی ہیں۔ سب کی خوشیوں کا احساس ہے انہیں۔ تمہاری عانیہ میڈم کو "اوکے" کر آئی ہیں۔"

"کیا سچ۔" مونس نے بھنگڑا ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ ان کی شادیاں ایک دن کے وقفے سے ہوئی تھیں مگر ولیمے کا فنکشن کمبائن تھا۔ فریدون انکل اور فرجند انکل نے شہرے کی طرف سے تمام تر انتظامات خود کیے تھے۔ آج سے چند دن پہلے ایسا کچھ ممکن ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

وہ اور مونس دونوں ہی اس کے پیچھے ہاسٹل میں آئے تھے۔ ان کی منتوں، وضاحتوں اور تمام تر دلائل کا اس کے پاس ایک ہی جواب تھا۔

"مجھے احساسات سے عاری لوگوں کے ساتھ نہیں رہنا۔ ان کی خاطر میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر چلی آئی تھی؟؟" وہ سخت طیش کے عالم میں اپنی چیزیں سوٹ کیس میں ٹھونستے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"نہیں، تم تو صرف میرے لیے یہاں آئی ہو۔ میرے پاکستان میں رہنے کے لیے۔" زارون نے اس کے سامنے سے سوٹ کیس اٹھا کر بند کیا اور مونس سے بولا۔

"اسے گاڑی میں رکھ کر آؤ۔"

"میرا سوٹ کیس واپس کریں۔ مجھے آپ کے ساتھ نہیں جانا۔ آپ کیا سمجھتے ہیں۔ میں ڈائن ہوں۔ میں عدن کے دل کو اجاڑوں گی قطعاً" نہیں۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں۔ مجھے یہاں نہیں رہنا۔" وہ مسلسل روتے ہوئے بے ربط بول رہی تھی۔ زارون اسے وضاحتیں، اپنی محبت کا یقین دلاتے دلاتے تھک چکا تھا مگر اس کی نہ ہاں میں نہیں بدلی تھی۔

"ایک مرتبہ میری آنکھوں میں دیکھ کر کہہ دو کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔" زارون نے اسے شانوں سے تھام کر جھٹکا دیا تھا۔ وہ سسکتے ہوئے دیوار سے جا لگی تھی۔ اور آنکھیں موندے دل پر بھاری پتھر کی سل رکھ کر چلائی۔

"نہیں ہے مجھے کسی سے بھی محبت وحبت۔"

"جھوٹ مت بولو تمہیں زارون سے محبت ہے۔ اسی لیے تو چمکتی دمکتی دنیا کو چھوڑ کر یہاں چلی آئی ہو۔" یہ آواز عدن کی تھی۔ ان سب نے بے ساختہ پلٹ کر دیکھا تھا۔ عدن اب اس کے قریب آ چکی تھی۔ پھر اس نے شہرے کے آنسو پونچھ ڈالے تھے اور آہستگی سے کہنے لگی۔

"مجھے معاف کر دو شہری! اور پلیز جانے کا فیصلہ بدل دو۔ زارون صرف تمہارا ہے۔ کسی کے دل پر زبردستی حکومت نہیں کی جا سکتی۔"

اسی پل دروازہ دھاڑ سے کھلا تھا۔ اور پھر فرجند انکل اور آنٹی بھی چلی آئی تھیں۔ ان کے پیچھے فریدو اور فرہاد چاچو بھی تھے۔ فائزہ اور ماہا بھی اپنے بچوں سمیت اسے لینے کے لیے آئی تھیں۔

"اب تو مان جاؤ شہری! پوری بارات تو آ چکی ہے۔" عدن نے بے ساختہ کہا تو وہ فرجند ماموں کے سینے میں منہ چھپا کر طمانیت سے مسکرا دی تھی۔ آنٹی نے بھی اس سے اوپری دل سے شاید شوہر کے خوف سے معافی مانگ لی تھی۔ اور شہرے تو انہیں ہاسٹل کے اس روم

میں دیکھ کر ہی تمام بدگمانی بھلا کر انہیں معاف کر چکی تھی۔ اس نے یہ خوشخبری سب سے پہلے مریم اور پھر ایما کو سنائی تھی۔ ایما نے دل سے اس کی خوشیوں کے صدا سلامت رہنے کی دعا کی۔ ایما اپنے بیٹے ایمان کے ہمراہ "ہوم لینڈ" میں ہی قیام پذیر تھی۔ اس نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اب وہ ہوم لینڈ کے نچلے پورشن میں معذور بچوں کی نرسری بنانے کے بعد ان کی تعلیم و تربیت میں مصروف ہو چکی تھی۔ ایما نے ہی اسے عاجف انکل کے بارے میں بتایا تھا کہ ان کا اکلوتا داماد سب کچھ ہتھیانے کے بعد رحمہ کو لے کر یورپ چلا گیا ہے۔ انکل اور آنٹی اب تنہا ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے جھگڑنے میں دن بتاتے ہیں۔

"میں نے تو اسے سات پہاڑیوں کے شہر "روم" کو دکھانے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ مگر اسے نتھیا گلی گھوڑا گلی۔ اور ایوبیہ کو دیکھنے کا کریز تھا۔ چیئر لفٹ پر بیٹھنے کے شوق میں اس نے ورلڈ ٹور کا چانس مس کر دیا ہے۔" زارون نے بھنا کر کہا تھا۔ اس کا ارادہ کسی یورپین ملک میں ہنی مون منانے کا تھا مگر شہری اسے مری کھینچ لائی تھی۔ جبکہ مری تو وہ لوگ ایک ہزار ایک مرتبہ گھوم چکے تھے مگر شہرے کو پاکستان کی سیر کا جنون تھا سو زارون کی تو مجبوری تھی مگر مونس نے بھی اپنا ارادہ بدل کر ان کے ساتھ مری آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسی پل شال لپیٹے ٹھنڈ سے ٹھٹھرتی عانیہ بھی برآمدے میں آ کھڑی ہوئی۔ شہرے کو بارش میں بھیگتے دیکھ کر وہ چلا اٹھی۔

"شہری کی بچی، بیمار پڑ جاؤ گی۔ بس کرو، بہت کر لیا شوق پورا۔ میں تمہارے لیے چائے بغیر چینی کے اور دو انڈے بوائل کر کے لاتی ہوں۔ دیکھو تو ٹھنڈ ہڈیوں میں گھس رہی ہے۔"

"رہنے دو عانیہ بی بی! اسے بارش میں بھیگ کر سردی سے اکڑنے کا شوق ہے۔ دیکھنا ابھی کچھ دیر بعد فالج کا اٹیک ہو جائے گا اس پر۔" زارون کی دھمکی نے اچھا خاصا اسے خوفزدہ کر دیا تھا۔ اسی لیے وہ کپڑے تبدیل کرنے کے لیے اندر بھاگی تھی اور پھر کچھ دیر بعد وہ صرف کھڑکی کھولے دسمبر کی بارش کا نظارہ کر رہی تھی۔ خوشیاں دروازے پر دستک دے رہی تھیں سو اس نے بہت سرشاری کے عالم میں دریچہ کھول دیا تھا۔ باہر سے مونس اور زارون کی ہنسی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ مونس، زارون کو انس کا ایس ایم ایس پڑھ کر سنا رہا تھا۔

"پیارے بھائیو! تم دونوں کپلز کو ہنی مون مبارک ہو۔ واپسی پر میرے گھر ضرور آنا اور میرے لیے ایک سوئٹر، ایک جیکٹ اور روا کے لیے کچھ گرم کپڑے اور دو تین شالیں ضرور لے کر آنا۔ میں تم لوگوں کا شدت سے انتظار کر رہا ہوں۔"

"بہت ہی کمینی چیز ہے یہ انس۔" زارون کا قہقہہ سنائی دے رہا تھا۔ شہرے بھی مسکراتے ہوئے سکون سے آنکھیں موند گئی تھی۔